بلراج — میرا بھائی
بھیشم ساہنی

بلراج
میرا بھائی

بھیشم ساہنی

مترجم

جلیس عابدی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

ترتیب

1- بچپن	7
2- لاہور میں	32
3- لاہور سے واپسی	43
4- سیواگرام میں	66
5- انگلستان سے واپسی	81
6- فلمی دنیا میں	97
7- تخلیقی نگارشات	130
8- گھر میں	147
9- پس نوشتہ	166

شبنم کے نام

جواب اس دنیا میں نہیں ہے

1

بچپن

میرے بڑے بھائی بلراج یکم مئی 1913 کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے تھے۔ ماتا جی ہمیں بتایا کرتی تھیں کہ بلراج کی پیدائش کے فوراً بعد جب وہ بستر پر نڈھال پڑی تھیں اور انھیں پتہ بھی نہ تھا کہ اُن کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے تو گھر کے باہر بینڈ باجے کی آوازیں سنتے ہی وہ بے ہوش ہوگئی تھیں۔ اس سے پہلے ہر بچے کی پیدائش پر اس کا استقبال ذرا مختلف ڈھنگ سے ہوتا رہا تھا۔ ایک ایک کرکے ہمارے گھر میں پانچ لڑکیاں آچکی تھیں۔ پتاجی کے بڑے بھائی پُرانے خیالات کے آدمی تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ گھر کے باہر چارپائی پر اس خبر کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ لڑکا ہوا ہے یا لڑکی۔ جیسے ہی انھیں بچی کی پیدائش کی اطلاع ملتی، وہ گالیاں، کوسنے دیتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے اور شدید بیزاری اور برہمی کے عالم میں سڑکیں ناپتے پھرتے۔ اس مرتبہ جب انھیں معلوم ہوا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے تو وہ لپک کر سیدھے بازار پہنچے اور اپنے ساتھ بینڈ والوں کو لے آئے، تاکہ جشن منایا جا سکے۔ بلراج کی پیدائش کے وقت ہماری پانچ بہنوں میں سے صرف دو بہنیں زندہ تھیں، باقی تین بہنیں یکے بعد دیگرے بچپن میں ہی بھگوان کو پیاری ہوگئی تھیں۔

بلراج کا نام پہلے یدھسٹر رکھا گیا تھا، جس کا تلفظ یدھشٹر کیا جاتا تھا۔ مگر بلراج کو اس نام سے جلد ہی دست بردار ہونا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ ہماری ایک بُواجی (پھوپھی) یہ نام ٹھیک طرح سے نہیں لے سکتی تھیں اور اکثر اسے رجسٹر، کے ساتھ گڈمڈ کر جاتی تھیں۔ ان دنوں پنجاب کے آریہ سماجی گھرانوں میں بچوں کے نام ہندو دھرم کی مقدّس کتابوں کے کرداروں کے نام پر رکھنے کا شوق خبط کی حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ چنانچہ جن بچوں کے نام پہلے سے ہی پنجابی زبان کے ہوتے، ان کے نام بھی بدل کر انھیں ہندی نام بخش دیے جاتے۔ مثلاً اسی مہم کے نتیجے میں ہماری ایک بہن ویراں والی کا نام بدل کر ویدوتی کر دیا گیا تھا۔

جس خاندان میں بلراج کا جنم ہوا تھا وہ متوسط طبقے کے سیدھے سادے، خدا ترس

لوگوں کا خاندان تھا۔ ہمارے پتا جی شری ہربنس لال ساہنی، جو پیشے کے اعتبار سے امپورٹ ایجنٹ تھے، غریبی اور تنگ دستی کے دن دیکھے ہوئے تھے۔ اپنی محنت اور جفاکشی کی بدولت وہ افلاس کے بھنور سے نکلے تھے۔ اب ان کی آمدنی معقول تھی۔ راولپنڈی میں کچھ جائداد بھی تھی۔ معاشی زندگی کا آغاز انھوں نے راولپنڈی میں کمشنری کے کلرک کے طور پر کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے یہ ملازمت چھوڑ دی تھی اور اپنا الگ امپورٹ بزنس کرنے لگے تھے۔ جب بلراج نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو پتا جی کا شمار شہر کے ممتاز اور معزز لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ کچھ ان کی دولت کی وجہ سے اور کچھ ان کے دھرم کرم کا پابند آریہ سماجی ہونے کے باعث شہر میں ان کی کافی عزت تھی۔ آریہ سماج سے انھیں واقعی بہت لگاؤ تھا، مگر اس لگاؤ کا اظہار ان کے مذہبی عقیدوں اور گھر میں ہونے والی پوجا پاٹھ کی رسموں کے ذریعہ اتنا نہیں ہوتا تھا جتنا سماج سدھار کی اس مہم کی مدد اور حمایت کے ذریعہ جس کا بیڑا ہندو سماج کی اصلاح کے لیے آریہ سماج نے اُٹھایا تھا۔

ہمارے خاندانی پس منظر سے متعلق کئی کہانیاں گھر میں بیان کی جاتی تھیں۔ ہم لوگ اوّلاً بھیرا کے رہنے والے تھے، جو پنجاب کے شاہ پور ضلع میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اب پاکستان میں شامل ہے۔ وہاں سے ترکِ وطن کر کے ہمارے دادا راولپنڈی میں آبسے تھے۔ بھیرا جھیلم ندی کے کنارے پر واقع ہے اور عہدِ وسطیٰ کا ایک پُرانا شہر ہے۔ ایک زمانے میں یہ تجارت اور کاروبار کا ایک اہم مرکز تھا۔ معلوم ہوتا ہے، دورِ ماضی میں اسے کافی تاریخی اہمیت حاصل تھی، کیونکہ محمود غزنوی کے ایک حملے کا نشانہ بھیرا بھی بنا تھا۔ اس تاریخی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے بھیرا کے باشندے کبھی نہیں تھکتے۔ اگلے وقتوں میں بھیرا شہر کے چاروں طرف لال پتھر کی فصیل تھی۔ شہر میں آنے جانے کے لیے چار بلند دروازے تھے۔ یہ سب اب کھنڈر بن چکے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ شاہی محلوں کے باقیات بھی نظر آتے ہیں، جنھیں شیش محل کہا جاتا تھا۔ بلراج دوبار بھیرا گئے۔ ایک بار اپنے بچپن میں، جب رسم کے مطابق ہماری بڑی بہن کی شادی کی تقریب میں پورا خاندان وہاں پہنچا تھا۔ یہ 1921 کے آس پاس کی بات ہے۔ دوسری مرتبہ بلراج 1961 میں بھیرا گئے، جب انھوں نے برِّ صغیر کی تقسیم کے لگ بھگ پندرہ برس بعد پاکستان کا دورہ کیا۔ بھیرا نے بلراج کے ذہن پر امٹ نقش چھوڑا تھا۔ یہ قصبہ کئی پہلوؤں سے بے مثال بھی تھا۔ ہماری جانی پہچانی بستیوں میں یہ واحد قصبہ تھا جو مکمل طور پر ذات اور ذیلی ذات کی بنیاد پر محلّوں میں بٹا ہوا تھا۔ چنانچہ وہاں ساہنیوں، سیٹھیوں، کوہلیوں غرض سب کے محلّے الگ الگ تھے۔ جب ہمارے دادا نے اس قصبے کو چھوڑا تھا تو اس کے اُجڑنے کی

شروعات اس سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ جہلم ندی اپنا رُخ بدل کر قصبے سے بہت دور بہنے لگی تھی۔ اور پھر شورے نے نمودار ہو کر یہاں کی زمین کی زرخیزی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ جب بلراج پہلی دفعہ خاندان کے ساتھ بھیرا پہنچے تھے تو اس وقت یہ ایک ویران سا قصبہ تھا۔ بہت سے مکانات زمین بوس ہو چکے تھے۔ کچھ گھروں کے قرونِ وسطیٰ کی دل کش تراش کے منقش دروازوں پر اس وقت بھی تالے لگے ہوئے تھے، اگرچہ ان کے آس پاس دیواریں بالکل ملبے کا ڈھیر بنی پڑی تھیں۔

ترکِ وطن کا مرحلہ ہمارے خاندان نے اس سے پہلے بھی طے کیا تھا۔ خاندانی روایتوں کے بموجب وہ ہجرت کابل (افغانستان) سے کی گئی تھی، مگر کب کی گئی تھی، یہ بات معلوم نہیں۔ قیاس یہی ہے کہ افغانستان میں کوئی سیاسی انقلاب برپا ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں پناہ گزینوں کے قافلوں نے اس سرزمین کو خیرباد کہا تھا۔ ان ہی میں ہمارے اجداد میں سے ایک بزرگ مہیش داس ساہنی شامل تھے۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ وہ شاہ پور ضلع کے میدانی علاقے میں آ بسے۔ اس طرح اُجڑنا، نقلِ وطن کرنا، پناہ گزینوں کی زندگی گزارنا ہمارے خاندان کے لیے خاصے جانے پہچانے معمولات رہے ہیں۔ آخری ہجرت ہمارے خاندان نے 1947 میں برصغیر کی تقسیم کے بعد راولپنڈی سے کی تھی۔

راولپنڈی میں ہمارے دادا لالہ ٹھاکر داس ایک وکیل کے یہاں منشی کے طور پر کام کرتے تھے۔ اُن کی بیوی یعنی ہماری دادی بہت سی نمایاں خوبیوں کی مالک تھیں۔ وہ مزاجاً بہت عبادت گزار اور انتہائی باہمت خاتون تھیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب ان کا ایک بیٹا عین عالمِ شباب میں وفات پا گیا تو وہ ذرا بھی نہیں روئیں۔ رونے دھونے کی جگہ وہ اپنے بیٹے کے پاس بیٹھ گئیں، اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور بھجن گاتی رہیں، پرارتھنا کرتی رہیں۔ بڑے صبر و سکون کے ساتھ انھوں نے بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت کیا۔ کہا جاتا ہے کہ قدرت نے انھیں شاعرانہ طبیعت بھی بخشی تھی اور وہ بھجن اور مناجات کے انداز کے اشعار اکثر موزوں کرتی رہتی تھیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ آنے والی نسلوں کو اپنے بزرگوں سے کچھ خصوصیتیں ضرور ورثے میں ملتی ہیں تو دادی کا بھی اپنی آنے والی نسلوں پر یقیناً اثر پڑا تھا، کیونکہ بعد کے کچھ افراد میں ادبی میلانات کافی نمایاں رہے۔ ہمارے خاندان میں ایسی بہت سی روایتیں بیان کی جاتی تھیں جن میں دادی کی دیانت داری اور نیک نیتی کا چرچا ہوتا تھا۔ مثلاً جب ہمارے پتاجی کمشنری میں جونیئر کلرک کے طور پر کام کر رہے تھے تو ایک مرتبہ کسی ٹھیکے دار نے اپنے بل پاس کرانے کی غرض سے انھیں دس روپے کا 'نذرانہ' پیش کیا۔ شام کو

انھوں نے یہ رقم اپنی ماں کے حوالے کی تو وہ ان پر برس پڑیں۔ کھری کھری سنانے کے بعد انھوں نے پتاجی کو فوراً ٹھیکے دار کے گھر جانے کی ہدایت کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک وہ رقم واپس کرکے نہ آئیں گے، انھیں گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔

بلراج کا بچپن جس گھر اور جیسے ماحول میں گزرا اس کی اپنی الگ انوکھی خصوصیتیں تھیں۔ پتاجی یوں تو بزنس مین تھے، مگر ان کے بزنس کا کوئی باضابطہ ٹھکانا نہ تھا۔ گھر کی نچلی منزل پر ہی انھوں نے ایک چھوٹا سا آفس بنا رکھا تھا، اور وہیں سے وہ اپنے سارے کاروبار کا بندوبست کرتے تھے۔ چند فائلیں، ایک ٹائپ رائٹر، ایک میز اور کچھ کرسیاں۔ بس یہی سارا دفتر تھا۔ ہفتے میں ایک بار (عام طور پر جمعرات کو) وہ ٹائپ رائٹر پر ایک انگلی سے خطوط ٹائپ کرتے نظر آتے تھے، کیونکہ باقاعدہ ٹائپ کرنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ہمارے خاندان میں وہ دن 'غیر ملکی ڈاک' کا دن کہلاتا تھا۔ اس روز پتاجی کے آفس میں جانا یا کسی اور طرح ان کی مصروفیت میں مخل ہونا ہم بچّوں کے لیے قطعی ممنوع تھا۔ اس طرح غیر ملکی ڈاک جمعرات کی شام کو ہی نمٹائی جاتی تھی اور پتاجی جمعرات کی صبح کو ہی اپنے خطوط ٹائپ کرنے بیٹھتے تھے۔ یہ بات آج بھی میرے لیے معمّہ بنی ہوئی ہے کہ وہ یہ کام ہفتے کے کسی اور دن کیوں نہیں کرتے تھے۔ اس روز سارے خاندان بھر پر خلجان طاری رہتا تھا۔ اور پھر ان کے خطوط ہمیشہ دیر سے ٹائپ ہوتے تھے، چنانچہ انھیں ریلوے اسٹیشن پر ڈاک کے حوالے کرنا ناگزیر ہوجاتا تھا۔ اس کام کے لیے گھر کے واحد نوکر تلسی کو طلب کیا جاتا تھا اور اسے تاکید کی جاتی تھی کہ خطوط ڈاک خانے یا ریلوے اسٹیشن لے جائے۔ وقت کی پابندی، نظم و ترتیب اور باقاعدگی، جو امپورٹ ایجنٹ کی لازمی خوبیوں میں شمار ہوتی ہیں، پتاجی میں یکسر مفقود تھیں۔ جمعرات کا سارا کام پورا ہوجاتا تو ہفتے کے باقی دنوں میں وہ پھر اپنے معمول کے، لگے بندھے ڈھرے پر چلنے لگتے۔ وہی صبح کو لمبی چہل قدمی، وہی آریہ سماج کی سرگرمیاں، وہی مختلف رفاہی اداروں میں مصروفیت، جن کے وہ سرکردہ رکن تھے۔

پتاجی غیر ملکی فرموں کے لیے آرڈر حاصل کرنے کا بزنس کرتے تھے۔ ان کے زیادہ تر ڈیلر کوئٹہ، کابل، سری نگر، پشاور وغیرہ جیسے دور دراز مقامات پر تھے اور مال انھیں زیادہ تر برطانوی اور فرانسیسی فرمیں سپلائی کرتی تھیں، اس لیے ان کی کاروباری مصروفیتیں بڑی حد تک خط لکھنے تک ہی محدود تھیں اور (جیسا کہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا) مراسلت کا فن انھیں آتا بھی خوب تھا۔

پتاجی کے آفس کے برابر کے کمرے میں طرح طرح کے سیمپلوں سے بھرے ہوئے بکس رہتے تھے۔ اس کمرے کو کبھی کبھار ہی کھولا جاتا تھا۔ بلراج کے لیے یہ جگہ علی بابا کے غار کی طرح پُراسرار تھی ـــــ بے پناہ تجسّس اور اشتیاق کا سرچشمہ، کیونکہ ان بکسوں میں دنیا بھر کے سیمپلوں کا مسحورکن ذخیرہ موجود تھا، مثلاً سنہرے کناروں والی چینی کی پیالیاں اور پرچیں، جن پر مجھے یاد رکھنا، مجھے بھولنا نہیں، وغیرہ کی قبیل کے دل چسپ پیغامات نقش ہوتے تھے، خوش نما دستوں والے چاقو، فرانس کی فیس کریمیں، مختلف قسموں کی پنسلیں، کپڑوں کے نمونے جن پر رنگین تصویریں ہوتی تھیں، موباف، فیتے، لیس، اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ۔ یہ بات نہ تھی کہ پتاجی ان سب ہی چیزوں کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ سیمپل تو ایکسپورٹ کرنے والی فرمیں انھیں یوں ہی بھیجتی رہتی تھیں، کیونکہ وہ ایک مشہور امپورٹر تھے۔ ویسے ان کے کاروبار کی خاص اشیاء موباف اور لیس تھیں، جنھیں وہ اپنے پشاور، کوئٹہ، کابل وغیرہ کے ڈیلروں کے لیے فرانس سے درآمد کرتے تھے۔ اس سے پہلے وہ سبز چائے کا بھی اچھا خاصا کاروبار کر چکے تھے، جسے وہ شنگھائی سے منگواکر کابل اور کشمیر میں بیچ دیتے تھے۔

پتاجی آرام کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ان کی تن آسانی کی ایک یقینی دلیل یہ بھی تھی کہ وہ ہر کام میں دیر لگاتے تھے۔ مثلاً جب دوپہر کے کھانے کا وقت ہوتا تو وہ اشنان (نہانے) کے لیے کھڑے ہوتے۔ جب رات کے کھانے کا وقت قریب ہوتا تو وہ اپنی چھڑی سنبھال کر چہل قدمی کو نکل جاتے۔ جب گھر کے سب لوگ رسوئی گھر میں بیٹھے ہوتے (ہم لوگ رسوئی گھر میں ہی کھانا کھاتے تھے) اور کھانے پر پتاجی کا انتظار ہو رہا ہوتا تو وہ پوجا کرنے بیٹھ جاتے۔

رسوئی گھر میں رات کے کھانے کا وقت ہمارے لیے گویا سارے دن کا بہترین حصّہ ہوتا تھا۔ ماتاجی چولھے کے پاس بیٹھی چپاتیاں بناتیں اور ہم چاروں بچّے (دو بھائی اور دو بہنیں) بیٹھ کر دونھالیوں میں ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ بلراج اپنے چٹکلوں، مزے مزے کی باتوں اور نقلوں سے سب کو ہنساتے رہتے۔ وہ طرح طرح کے لوگوں کی نقلیں بنانے میں ماہر تھے۔ تلسی، جو ضلع پونچھ کے گاؤں رومل کا رہنے والا تھا اور ہمارے یہاں لگ بھگ بارہ برس سے رہ رہا تھا، کوئی اوٹ پٹانگ بات کہہ بیٹھتا تو ہماری دونوں بہنوں پر ہنسی کا دورہ سا پڑ جاتا۔ انھیں تلسی کو چھیڑنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ پتاجی بھی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے قہقہوں میں شریک ہو جاتے۔ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق وہ قہقہہ بلند کرنے سے پہلے تالی ضرور بجاتے۔ اگر وہ اس "محفل" میں شریک نہ بھی ہوتے تو اپنی اولاد کے لیے فاصلے سے ہی ان کی آنکھوں میں محبّت اور شفقت کی جوت

روشن رہتی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم بچّے تو اپنے اپنے بستر کا رُخ کرتے اور پتا جی اُٹھنے بیٹھنے کے بڑے کمرے میں ٹہلتے رہتے۔ اس وقت ماتا جی سے ان کی باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا، جو عموماً چارپائی پر بیٹھی کچھ سیتی پروتی نظر آتی تھیں۔ پتاجی حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے۔ آریہ سماج کی سرگرمیاں ان کا خاص موضوع ہوتیں۔ وہ سماج سدھار کی ضرورت، بچّوں میں دھرم اور امید پرستی کا جذبہ جگانے کی اہمیت، ہندی اور سنسکرت کے مطالعے کے فوائد اور مسلمانوں کے رول کا اکثر ذکر کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندو سماج میں اخلاقی پستی مسلمانوں نے پیدا کی ہے۔

ماتا جی دھرم میں رنگے ہونے کے باوجود پتا جی سے بہت مختلف تھیں۔ انھوں نے زیادہ آزاد روح اور زیادہ آزاد ذہن پایا تھا۔ جو کچھ پتا جی کہتے اور مانتے تھے، ماتا جی آنکھیں بند کر کے لازماً ان کی تائید نہیں کرنے لگتی تھیں۔ اکثر وہ آریہ سماج پر اور خود پتا جی پر نکتہ چینی بھی کر بیٹھتی تھیں۔ بارہا وہ سکھوں کے گوردوارے میں بھی گئیں، پنجابی میں پاٹھ بھی کیا، سناتنی، سادھوؤں اور اُپدیشکوں کی تقریریں بھی سنیں۔ ماتا جی بے پڑھی لکھی تھیں، مگر کھوج اور جستجو کا جذبہ ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے خود اپنی لگن اور کوشش سے پنجابی اور ہندی لکھنا پڑھنا سیکھ لی تھی۔ علم حاصل کرنے کی خواہش انھیں اس قدر بے تاب کیے رکھتی تھی کہ وہ اردو اور انگلش سیکھنے پر بھی کمربستہ ہو گئی تھیں۔ ایک بار سنسکرت پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہوا تھا لیکن حالات ان کے لیے حوصلہ افزا نہ تھے، اس لیے ان زبانوں کی تحصیل میں وہ زیادہ کامیابی نہ حاصل کر سکیں۔

پتاجی کے مقابلے میں ماتا جی زیادہ رکھ رکھاؤ والی اور دُھن کی پکّی تھیں۔ پتاجی سادگی پر جان دیتے تھے۔ انھیں اس بات کی زیادہ پروا نہ تھی کہ کوئی کس ڈھنگ سے رہتا ہے اور کیسے کپڑے پہنتا ہے۔ لیکن ماتا جی کو ہر آن یہی ارمان رہتا تھا کہ ان کے بچّے خوش پوش نظر آئیں، کھیلنے کو انھیں اچھی سے اچھی چیز ملے، میلوں اور تیوہاروں میں انھیں خوب سیر کرائی جائے۔ اسی لیے دسہرے، دیوالی جیسے تیوہاروں کے موقع پر ہمیشہ گھر میں ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ پتا جی بلراج کو اور مجھے دسہرے کا میلہ دکھانے کے لیے لے گئے۔ لیکن دن ڈھلتے ڈھلتے ہم دونوں ان سے بچھڑ کر کھو چکے تھے۔ آریہ سماج کے کئی کارکن اور چپراسی ہماری تلاش پر مامور کیے گئے۔ انجام کار ہم دونوں کا سراغ مل ہی گیا، مگر اس طرح کہ میں شہر کے ایک سرے پر تھا تو بلراج دوسرے سرے پر! لیکن اس بپتا کے بعد بھی ماتا جی کا جوش خروش ماند نہیں پڑا۔ ان ہی کے زور دینے پر

پہلا ہارمونیم ہمارے گھر میں آیا، اور اس کے بعد پہلا گراموفون۔
اکیلے میں ماتا جی کبھی کبھی ہمیں گیت بھی گا کر سناتی تھیں۔ ان گیتوں سے اداسی اور تقدیر کا جبر جھلکتا تھا، زندگی کے بے اعتبار اور موہوم ہونے کا تاثر پیدا ہوتا تھا۔ جب وہ اپنی دھن میں گاتی ہوتیں تو کبھی کبھی پتا جی نیچے اپنے آفس سے ہی چلا کر ماتا جی کو تاکید کرتے کہ ایسے اُداس گیت نہ گائیں۔ وہ کہتے: "بچوں کو بیراگ کے گیت نہیں سننے چاہئیں۔ سنانا ہی ہے تو انھیں ولولہ خیز، طربیہ گیت سناؤ۔" مگر بے چاری ماتا جی طربیہ نغموں کے لیے حوصلہ کہاں سے لاتیں۔ وہ پہلے ہی اُداسی کا پیکر بن چکی تھیں۔ ان کے تین بچے کم سنی میں ہی ایک ایک کرکے انھیں داغِ مفارقت دے چکے تھے۔
جہاں تک گھر چلانے کا تعلق ہے، پتا جی اور ماتا جی میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے لیے قابلِ پیروی مثال نہیں بن سکتا تھا۔ ماتا جی اکثر اپنا چابیوں کا گچھا کہیں رکھ کر بھول جاتی تھیں اور پھر سارا خاندان اس کی تلاش میں گھر بھر کو تہہ و بالا کر ڈالتا تھا۔ دودھ اکثر اُبل کر گر جاتا تھا اور دہی اکثر ٹھیک طرح نہیں جمتا تھا۔ بیسیوں موقعوں پر تو یہ معلوم کرنے کے لیے جیوتشی کی خدمات بھی حاصل کی گئیں کہ چابیوں کا گچھا کس جگہ موجود ہو سکتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ماتا جی اکثر گھر سے نکل کھڑی ہوتی تھیں۔ وہ رشتہ داروں سے ملتیں، ست سنگ میں شریک ہوتیں، اور پھر کسی دورہ کرتے ہوئے سادھو کی کتھا سننے پہنچ جاتیں۔ جب وہ گھر واپس آتیں تو اکثر دن ڈھلنے کو ہی ہوتا چنانچہ وہ جلدی جلدی کھانا تیار کرنے لگتیں۔
ہمارا گھرانہ بالکل روایتی قسم کا گھرانہ تھا۔ چھوٹا سا کنبہ تھا جس کے سب ہی افراد کو ایک دوسرے سے گہرا لگاؤ تھا۔ پتا جی دھارمک آدمی تھے، لیکن متعصب نہ تھے۔ ہم سب دن میں دوبار، صبح کو اور شام کو پوجا کیا کرتے تھے، مگر ہم کسی مخصوص، لگی بندھی پوجا کے پابند نہ تھے۔ کبھی کبھی ہَوَن بھی ہوتا تھا۔ پورا خاندان پوتر اگنی کے گرد بیٹھ جاتا تھا۔ ہمارا ملازم تلسی بھی ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ اسے خاندان کا ہی فرد سمجھا جاتا تھا۔ بلراج کو ہَوَن بہت پسند تھا، اگرچہ ہم بچے (جن میں بلراج بھی شامل تھے) ان منتروں کے معنی بھی نہیں جانتے تھے جو ہم پڑھتے تھے اور نہ ان رسموں کی اہمیت سے واقف تھے جو پوری کی جاتی تھیں۔ بلراج کو ہَوَن میں ایک طرح کی بے پناہ کشش، ایک قسم کی مسحور کن کیفیت نظر آتی تھی۔ یہ کشش رقصاں شعلوں میں تھی، یا چڑھاوے کی رسم میں، یا دھونی کی خوشبو اور منتروں کے پڑھتے سے پیدا ہونے والی فضا میں، یا ان سب میں، اس کا تعین کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ بلراج اپنے بچپن میں ہَوَن کے معاملے میں ہمیشہ بہت زیادہ

جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے تھے۔

'یہ کرو'، اور 'وہ نہ کرو' کا عام ضابطۂ اخلاق ہمارے یہاں بھی رائج تھا۔ مثلاً یہ کہ چھوٹوں کو بڑوں کی عزت کرنا چاہیے اور ان کا کہنا ماننا چاہیے، جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، گالیاں اور گندی باتیں زبان پر نہیں آنی چاہئیں، وغیرہ۔ بلراج کے سر کے بال خشخشی تراشے جاتے تھے اور ان میں ایک خاصی نمایاں چوٹی نظر آتی تھی۔ سینما ہمارے لیے ممنوع علاقہ تھا۔ ٹھنڈے پانی سے اشنان، لمبی چہل قدمی، پوجا اور پرارتھنا، ایسا مطالعہ جس سے کردار بہتر بنے اور ایسی نباتی غذا جس سے صحت اچھی رہے، ہمارے یہاں اِن ہی کا دور دورہ تھا۔ ہندی میں چھپی ہوئی اخلاقی تعلیمات کئی کمروں کی دیواروں پر آویزاں تھیں۔ ان میں سے ایک چارٹ کے روپ میں تھی، جس میں نیکی اور بدی کی صراحت کی گئی تھی۔ اس کے اسلوب کا اندازہ حسبِ ذیل نمونے سے لگایا جاسکتا ہے:

سادگی کا مطلب زندگی ہے، دکھاوے کا مطلب موت۔
سخت کوشی کا مطلب زندگی ہے، عیش کوشی کا مطلب موت، وغیرہ۔
تلسی کی رامائن کے کچھ اشعار بھی دیواروں کی زینت بنے ہوئے تھے، مثلاً:

جہاں سُمتی تہاں سمپتی نانا
جہاں کُمتی تہاں وِپتی ندانا

(جہاں دانائی ہے، وہاں خوش حالی ہے۔ (اور) جہاں بے اصولی ہے وہاں مصیبت ہے۔)

ہمارے طرزِ زندگی میں کچھ انوکھی خصوصیتیں بھی تھیں جن کے باعث ہم بچے کسی قدر الجھن میں پڑ جاتے تھے۔ بزنس مین کی حیثیت سے پتاجی کا کاروباری تعلق مسلمان تاجروں سے کافی رہتا تھا۔ ان میں پٹھان بھی شامل تھے۔ یہ لوگ اکثر ہمارے یہاں آتے رہتے تھے۔ پتاجی ویسے تو مسلم فرقے کے خلاف تحقیر آمیز باتیں دل کھول کر کیا کرتے تھے، مگر ان مہمانوں کے ساتھ ان کا رویہ نہایت دوستانہ ہوتا تھا۔ وہ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے، انھیں پُرتکلف کھانا کھلاتے تھے، مگر ان کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ سارے برتن جن میں انھیں کھانا کھلایا گیا تھا دہکتے ہوئے کوئلوں سے 'پاک' کیے جاتے تھے۔ عام دنوں میں ہمارے یہاں برتنوں کی صفائی اس ڈھنگ سے نہیں ہوتی تھی۔ ہم جس علاقے میں رہتے تھے، وہاں مسلمان زیادہ تھے۔ اپنے مسلمان پڑوسیوں سے پتاجی کے دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے بیٹوں کو مسلمان بچوں

کے ساتھ باہر کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہماری دو بہنیں لڑکیوں کے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ یہ اسکول آریہ سماج چلاتا تھا۔ اور پھر بھی مڈل اسکول تک پہنچنے سے پہلے ہی پتاجی نے ان کی تعلیم کا سلسلہ بند کرا دیا تھا۔ بڑی عجیب و غریب پابندیوں کے تحت ان دونوں بہنوں کی پرورش ہوئی تھی۔ ہمارے مکان کی دوسری منزل پر سڑک کے رُخ پر ایک بالکنی تھی۔ ہماری بہنوں کو اس بالکنی پر جانے۔ گھر کی کسی بھی کھڑکی سے باہر جھانکنے کی قطعی اجازت نہ تھی۔ ان سے یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ وہ نہ زور سے ہنسیں گی، نا ہی اونچی آواز سے گائیں گی۔ اگر اتفاق سے کبھی ان کی آواز اتنی بلند ہو جاتی کہ پڑوسی اُسے سُن سکیں تو نیچے سے پتاجی کی زوردار ڈانٹ فوراً اُبھرتی۔ اگر گلی میں کوئی راہ گیر عشقیہ گیت یا کوئی پنجابی 'ٹپہ'، گاتا ہوا گزرتا (اُن دنوں اکثر ایسا ہوتا تھا) تو ایسے موقعوں کے لیے ہم بچوں کو تاکید کی گئی تھی کہ ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیں، تاکہ ہم اس عشقیہ گیت کے 'بازاری' بول نہ سُن سکیں۔

ایسی تھی ہمارے گھر کی فضا، جس میں بلراج نے اپنا بچپن گزارا۔

پتاجی کو آریہ سماج سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ اپنے بچوں کو انھوں نے کسی باقاعدہ اسکول میں داخل کرانے کی بجائے ایک چھوٹے سے 'گوروکل' میں بھیجنا مناسب سمجھا تھا۔ یہ گوروکل شہر سے باہر واقع تھا اور 'گوروکل پوٹھوہار' کہلاتا تھا۔ اسے آریہ سماج کی 'گوروکل منڈلی' چلاتی تھی۔ بلراج کے داخلے کی رسم پورے اہتمام کے ساتھ ادا کی گئی۔ ان کا سر مونڈا گیا۔ ہَوَن ہوا۔ ویدوں کے اشلوک پڑھے گئے۔ اس کے بعد گرو نے بلراج کو برہم چاری کا 'یگیوپاوِت' (مقدس دھاگہ جسے جنیو بھی کہتے ہیں) اور پیلے رنگ کی دھوتی عطا کی۔ رسم پوری ہو گئی تو بلراج کو ہدایت کی گئی کہ پیالہ ہاتھ میں لے کر حاضرین کے درمیان پھیرا کریں اور بھکشا مانگیں، کیونکہ روایت کے بموجب برہم چاریوں کا یہی معمول تھا۔ حاضرین میں زیادہ تر پتاجی کے آریہ سماجی دوست شامل تھے، جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بلراج کا پیالہ نوٹوں اور سکوں سے بھر دیا۔ داخلے کی رسم کا یہ حصّہ ماتاجی کو زیادہ پسند نہیں آیا۔ اور اس وقت تو وہ بہت جھنجھلائیں جب انھیں پتہ چلا کہ یہ ساری رقم گرو نے 'گرو دکشنا' کے نام پر ہتھیالی ہے۔

گوروکل شہر سے باہر ایک دو منزلہ عمارت میں واقع تھا۔ ہمارے گھر سے اس کا فاصلہ لگ بھگ چار میل تھا۔ بلراج ان دنوں تقریباً سات برس کے تھے۔ ہر صبح کو اتنی دور پیدل جانا اور شام ڈھلے گھر واپس آنا ہمارے لیے سہل نہ تھا۔ اتنا لمبا فاصلہ ہمیں ہلکان کر دیتا تھا۔ ہم دن رات گوروکل میں

ہی رہنے والے برہم چاری نہ تھے، ہم صرف دن میں وہاں حاضر رہتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد بلراج کے لیے اور میرے لیے گورو کل آنا جانا نسبتاً آسان ہو گیا۔ پتاجی نے ہمارے لیے ایک گھوڑا خرید دیا۔ ویسے 'گھوڑا'، اسے سخت بات کو نرم الفاظ میں ادا کرنے کا فن برت کر ہی کہا جا سکتا تھا، کیونکہ حقیقت میں وہ ایک سن رسیدہ، اڑیل ٹٹو تھا، جسے صبح سویرے شہر سے باہر جانے کے تصور سے ہی وحشت ہوتی تھی اور وہ بھی ایسی صورت میں جب دو لڑکے اس کی پشت پر سوار ہوں۔ چنانچہ سامنے سے اسے گھر کا ملازم کھینچتا ہوا چلتا تھا۔ لیکن واپسی کے سفر میں دنیا بھر کی طاقت اور پھرتی اس کے اندر سما جاتی تھی اور کبھی کبھی وہ اپنی شہ زوری اور برق رفتاری کے عالم میں ہمیں اپنی پشت سے گرا بھی دیتا تھا۔

گورو کل میں کل ملا کر تقریباً چالیس برہم چاری تھے۔ ان میں سے زیادہ تر غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ضلع کے مختلف حصّوں سے آئے ہوئے تھے۔ تعلیمی نصاب بیش تر سنسکرت قواعد اور زبان پر مشتمل تھا۔ بلراج کو 'لگھوکودی' (با تشریح سوتر۔ یعنی گردانیں) پڑھائی گئی۔ سوتر یاد کرنے کے معاملے میں بلراج کافی تیز نکلے۔ انھوں نے ایک سو سے زیادہ سوتر تشریح کے ساتھ مختصر سے عرصے میں ہی زبانی یاد کر ڈالے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے مطلب کا انھیں خاک پتہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان کی لکھائی بھی بہت عمدہ تھی۔ لوگ انھیں ذہنی طور پر وقت سے پہلے آگے بڑھ جانے والا بچہ سمجھتے تھے ـــــ اطاعت شعار، دوسروں کا احترام کرنے والا، ایماندار۔ بسنتی کپڑوں میں وہ بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کوئی نیا نیا سنیاسی ہو۔

اتوار کے روز کمسن برہم چاریوں کی پوری ٹولی بسنتی کپڑوں میں ملبوس ایک بزرگ 'ون پرستھی' کی رہنمائی میں گورو کل سے روانہ ہوتی تھی اور شہر کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے آریہ سماج کا رُخ کرتی تھی۔ سر منڈے ہوئے، ہاتھوں میں ڈنڈے لیے ایک قطار میں چلتے ہوئے وہ بُدھ بھکشوؤں جیسے نظر آتے تھے۔ آریہ سماج کی دو منڈلیوں میں سے پتاجی کا تعلق 'کالج منڈلی' سے تھا جو مغربی انداز کی جدید تعلیم کی حامی تھی اور بہت سے ڈی اے وی اسکول اور کالج چلا رہی تھی۔ دوسری منڈلی 'گورو کل منڈلی' کہلاتی تھی۔ یہ تعلیم کے قدیم، کلاسیکی اسلوب کو جاری رکھنے کے حق میں تھی۔ چنانچہ اس نے جا بجا بہت سے گورو کل قائم کر رکھے تھے۔ 'کالج منڈلی' سے قریبی وابستگی کے باوجود پتاجی اگر اپنے بیٹوں کو گورو کل میں بھیجنے پر آمادہ ہوئے تھے تو اس کا سبب شاید ان کا یہ ارمان تھا کہ ان کے بیٹے ہندی اور سنسکرت میں خوب مہارت

حاصل کریں۔
ایک روز گورو کل میں پڑھائی کی روایت کا خاتمہ اس طرح یکایک ہوا جس کا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ بلراج نے اچانک اعلان کر دیا کہ وہ گورو کل کسی بھی حالت میں نہیں جائیں گے۔ اس سہ پہر کا سارا منظر آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ بلراج آفس میں پتا جی کی میز کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا اور ان کی آواز میں مستحکم ارادے کی جھلک تھی۔
پتا جی نے ٹائپ رائٹر پر سے نظریں اٹھائیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان کے دل کو دھچکا لگے گا اور وہ طیش میں آ جائیں گے، مگر انھوں نے ابروؤں کو اچکا کر صرف اتنا کہا "کیوں؟ کیا بات ہے؟ گورو کل میں تم کیوں نہیں پڑھنا چاہتے؟"
"وہاں ہمیں کچھ نہیں پڑھایا جاتا" بلراج کا جواب تھا۔ "میں تو کسی باقاعدہ اسکول میں پڑھنا چاہتا ہوں"
ایک لمحے کے لیے دہشت انگیز خاموشی چھائی رہی۔ پھر پتا جی کے ہونٹوں پر یکایک ان کی خاص پیار اور شفقت بھری مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر گھر کے اندرونی صحن میں پہنچے اور چلا کر ماتا جی کو بلانے لگے۔ جب گھر میں کوئی اہم واقعہ رونما ہوتا اور وہ ماتا جی سے مشورہ کرنا چاہتے تو ان کا طرزِ عمل یہی ہوتا تھا۔
ماتا جی آئیں اور چہرا اجڑھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گئیں۔ ان کے ہاتھ ان کی گود میں رکھے تھے۔ جیسے ہی انھیں بلراج کے فیصلے کا علم ہوا، وہ کہنے لگیں: "ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ آپ کے آریہ سماجی بھائیوں کا اور کون سا ایسا گھرانہ ہے جس کا لڑکا گورو کل میں پڑھ رہا ہو؟ پھر میرے بیٹے نے ہی کون سی ایسی خطا کی ہے کہ اسے اس طرح 'بھکاری' بنا دیا جائے؟"
ماتا جی گورو کل کی حامی پہلے بھی کبھی نہیں رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہاں کیا پڑھایا جاتا ہے۔ اس کی انھیں پروا بھی نہیں تھی۔ لیکن اتنا علم انھیں ضرور تھا کہ برہم چاری بھکاری کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور یہ بات انھیں قطعی پسند نہیں تھی۔ اس روز اجلاس بہت مختصر رہا۔ بلراج کا چہرہ ابھی تک تمتمایا ہوا تھا اور وہ اپنے ارادے پر اٹل نظر آ رہے تھے۔ ہماری توقع کے خلاف پتا جی جلد ہی پسیج گئے۔ وہ پھر مسکرائے اور کہنے لگے "میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم وہاں لمبے عرصے تک پڑھتے رہو۔ میری تو صرف یہ خواہش تھی کہ ہندی اور سنسکرت میں تم خوب مہارت حاصل کر لو۔ ٹھیک ہے، کل سے تم ڈی اے وی اسکول جایا کرو گے"

یوں گورو کل کا مختصر سا باب تمام ہوا۔ اگلے روز بلراج ڈی اے وی اسکول کی چوتھی کلاس میں داخل ہو گئے۔ تاہم ان کی مذہبی اور سنسکرت کی پڑھائی گھر پر جاری رہی۔ اس کام کے لیے پتاجی نے ایک ٹیوٹر کا بندوبست کر دیا۔ گھر پر ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا یہ سلسلہ اگلے پانچ چھ برس تک جاری رہا۔ اسکول میں اردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ جلد ہی انگریزی ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جانے لگی۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اس روز اگر بلراج نے جرأت کا مظاہرہ کر کے اپنے دل کی بات نہ بتائی ہوتی تو گورو کل میں ان کی تعلیم کا دور کم از کم دو تین برس تک اور چلتا۔

اسکول کی فضا یکسر مختلف تھی۔ وہاں زندگی زیادہ آزاد، زیادہ رنگا رنگ تھی۔ بلراج کو اب گلی میں کھیلنے کی چھوٹ بھی مل گئی تھی۔ ان کے بہت سے لڑکے دوست بن گئے تھے۔ ان میں اکثر کا تعلق نچلے متوسط طبقے کے گھرانوں سے تھا۔ ان کی بدولت بلراج کو طرح طرح کے تجربوں سے دوچار ہونے کا موقع ملا۔

بلراج کے اسکول کے دنوں کی یادیں تازہ کرنا میرے لیے بڑا خوش گوار عمل ہے۔ بے جھجک پہل کر ڈالنے کا جذبہ، اور ایجاد اور اختراع کی صلاحیت سے مالا مال بلند پرواز ذہن ان کے لڑکپن کے برسوں پر پوری طرح چھایا رہا۔ ان خوبیوں کا اظہار ان کے کھیلوں میں بھی ہوتا تھا اور پڑھائی وغیرہ میں بھی۔ کھیلوں کے انتخاب میں بھی وہ عام ڈگر سے ہٹ کر چلتے تھے۔ ایک مرتبہ آریہ سماج میں ایک تیر انداز نے تیر کمان سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اگلے ہی روز بلراج نے خود ہی اپنے لیے کمانیں اور تیر بنا ڈالے اور اس تیر انداز ہی کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر نشانے پر تیر چھوڑنے لگے۔ راولپنڈی میں ہمارے گھر کے قریب ہر سال مارچ کے مہینے میں گھوڑوں اور گھوڑ سواری کا میلہ ہوتا تھا۔ میلے کے اختتام پر نیزے کی کھونٹیاں گاڑنے کے مقابلے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ گھوڑ سوار ہاتھوں میں برچھے سنبھالے برق رفتاری کے ساتھ حملہ آور ہوتے اور زمین میں گڑی ہوئی لکڑی کی میخ کو نشانہ بناتے۔ ان کی دیکھا دیکھی بلراج کو بھی یہ کھیل کھیلنے کا شوق ہوا۔ فرق اتنا تھا کہ ہمارے پاس نہ برچھے تھے، نہ گھوڑے۔ چنانچہ ہمارے کھیل میں کھلاڑی کو اپنی ٹانگوں کے سہارے ہی دوڑ کر حملہ کرنا ہوتا تھا۔ نشانے پر وار لاٹھی سے کیا جاتا تھا، جس کے ایک سرے پر نوکیلی کیل لگا دی گئی تھی۔

بلراج گھر میں ڈرامے بھی پیش کیا کرتے تھے۔ وہ سوامی دیانند، رانا پرتاپ، شرون کمار وغیرہ کی زندگی کے اہم واقعات ناٹک کے روپ میں دکھاتے تھے۔ ان کے ڈراموں کے تماشائی ہماری دو بڑی بہنیں، ماتاجی اور کبھی کبھی پتاجی اور گھر کا ملازم تلسی ہوتے تھے۔ بلراج ہلدی گھاٹی

ہیں دادِ شجاعت دیتے ہوئے رانا پرتاپ یا اپنے بوڑھے، اندھے گرو کی سیوا کرتے ہوئے مول شنکر (سوامی دیانند کا بچپن کا نام) بنتے تھے۔ یا پھر محلے کی گلیوں میں سکندر اور پورس کے درمیان تاریخی جنگ چھڑ جاتی، جس میں چھتوں پر سے غلیلیں چلا کر دونوں فریق جم کر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے۔ بلراج کا ایک اور مرغوب مشغلہ سوامی دیانند کی زندگی کے حالات سینما کے انداز میں پیش کرنے کا تھا۔ سلائڈ کا کام کاغذ کے ٹکڑے دیتے تھے جن پر الفاظ لکھ کر اس طرح سے تراش دیے جاتے تھے کہ جب انھیں موم بتی کی روشنی کے سامنے رکھ دیا جاتا تو دیوار پر ان کا عکس بہت خوش نمائی کے ساتھ بڑا ہو کر پڑنے لگتا۔ جب بلراج ساتویں کلاس میں تھے تو انھوں نے ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔ ایک ورق کے اس رسالے کا نام "حقیقت" تھا اور اسے ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ اس میں ہاکی میچوں کی خبریں، مذہبی مضامین اور مورتی پوجا، بیوہ کی شادی وغیرہ جیسے بحث انگیز موضوعات پر تحریریں شامل ہوتی تھیں۔ اس رسالے کے صرف تین شمارے نکلے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ سبب یہ تھا کہ اسے ہاتھ سے لکھنے میں محنت بہت پڑتی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی ایک وجہ تھی۔ بلراج کی بیش تر سرگرمیوں میں بے جھجک پہل کرنے کا جذبہ ہمیشہ نمایاں رہا تھا۔ اسی کیفیت کے زیر اثر وہ ہر اس کھیل سے جلد ہی اُکتا جاتے تھے، جسے وہ کئی بار کھیل چکے ہوں اور اپنے لیے کوئی نیا کھیل ایجاد کر لیتے تھے۔ بعد کی زندگی میں بھی انھیں ایک پیشہ چھوڑ کر دوسرا پیشہ اپنانے میں یا زندگی کے ایک خاص، لگے بندھے ڈھرے سے دامن چھڑا کر کسی نئی راہ پر چل نکلنے میں کبھی زیادہ وقت نہیں لگا۔ ان کا ذہن ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتا تھا۔ بیتے ہوئے دنوں کے لیے ان کے دل میں ہڑک کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ ماضی کی خوش گوار یادیں ان پر نشہ بن کر کبھی سوار نہیں ہوئیں۔ ایک بار کوئی بات ان کے دل میں بیٹھ جاتی تو آسیب بن کر ان کے حواس پر چھا جاتی۔ پھر جب تک وہ اسے حقیقت کا جامہ نہ پہنا لیتے، انھیں چین نہ آتا۔

دوسروں کی باتوں کی پیروی کرنے کی جگہ خود اپنے ذہن سے سوچنے، اپنے ارادے پر عمل کرنے اور اپنے حق پر اڑ جانے کی عادت بلراج کو بہت پہلے ہی پڑ گئی تھی۔ بہت زیادہ لاڈ پیار کرنے والے ماں باپ کے ہاتھوں بگڑ جانے والے کچھ بچوں کا رویہ عموماً یہی ہوتا ہے۔ بلراج کو اگر زیادہ دُلار ملتا تو اس کے لیے کافی جواز بھی موجود تھا۔ ہمارے خاندان میں پانچ بہنوں کے بعد وہ پہلے لڑکے تھے اور ہمارے والدین اتنے روایت پسند یقیناً تھے کہ خاندان

کے نام کو قائم رکھنے والے کی پیدائش پر خوشیاں منائیں۔ بلراج کا رنگ گورا تھا، صورت اچھی تھی۔ خوبصورت بچّے یوں بھی بہت زیادہ تعریف سُن سُن کر خودنما اور خود پرست بن جاتے ہیں۔ مگر ہمارے خاندان میں صورتِ حال ذرا مختلف تھی۔ ہمارے والدین سادگی اور سخت کوشی کی زندگی گزارتے تھے۔ پتاجی کی ہمیشہ یہی آرزو رہتی تھی کہ ان کے بچّے، خاص طور سے بیٹے سادہ، محنتی اور جفاکش بنیں اور تصنّع سے دور رہیں۔ مادّی طور پر وہ کافی خوش حال ہو گئے تھے، مگر گھر میں رہن سہن کا انداز وہی تھا جیسا نچلے متوسّط طبقے کے گھرانوں میں ہوتا ہے۔ عمدہ ملبوسات، آرائش کا تام جھام اور عیش کا سامان گھر میں کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ پیالیاں اور پرچیں بھی گھر میں اس وقت آئے تھے جب بلراج کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل بھی ان ہی دنوں وارد ہوئی تھی۔ ایسی ساری چیزوں کو 'ماڈرن' ہونے کی دلیل تصور کیا جاتا تھا۔ پتاجی کو شک تھا کہ ان سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ وہ ان کو نو وارد یوروپین طرزِ زندگی کی علامت سمجھتے تھے جس سے وہ بہت زیادہ بدظن تھے۔ ماتاجی پہلے سے ہی تقدیر پرست تھیں اور پتاجی پر ان دنوں اُبھرتے ہوئے متوسط طبقے کے نظریات نے گہرا نقش جما رکھا تھا جو کڑی محنت، دیانت داری اور بھرپور رجائیت کے بوتے پر ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے کا قائل تھا۔ اس لیے بلراج کی ناز برداری نہ پتاجی کرتے تھے، نہ ماتاجی۔ ہمارے گھر میں خوشبودار تیل تک کبھی نہیں آیا۔ 1929 کے آس پاس جب شہر میں بجلی سپلائی کمپنی قائم ہوئی تو پتاجی نے اپنے گھر میں بجلی کی فٹنگ کرانے کے معاملے میں کچھ بھی جوش نہیں دکھایا۔ شہر میں ہمارا مکان فی الواقع آخری مکان تھا جو بجلی کی روشنی سے فیض یاب ہوا۔ اور اس وقت بھی مدھم سے مدھم بلب گھر میں لگائے گئے تھے، کیونکہ پتاجی کا خیال تھا کہ بجلی کی روشنی بینائی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ بلراج کو سر پر چند انچ لمبے بال رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ پیروں میں پہننے کے لیے ہمیشہ 'گاماشاہی جوتیاں' ہی انھیں ملتی تھیں۔ ان جوتیوں کا 'مزہ' وہی شخص جان سکتا ہے جس نے انھیں پہنا ہو۔ ان کے چمڑے کو نرم کرنے کے لیے پہلے کئی دن تک ان کے اندر ڈھیر سا السی کا تیل ڈالنا پڑتا تھا۔ بھیرا کے لوگوں کے بارے میں یہ روایت عام طور پر بیان کی جاتی تھی کہ اگر ان کی قمیص صاف ہے تو پاجامہ ضرور میلا ہونا چاہیے۔ تن کے سارے کپڑوں کا اچھی طرح دھلا ہوا اور صاف ستھرا ہونا ان کی نظر میں بُرا شگون تھا۔

بلراج ارادے کے پکّے تھے، مگر وہ سرکش اور ضدی نہ تھے۔ مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں

جب انھوں نے کوئی شے اپنے لیے حاصل کرنے کی ہٹ پکڑی ہو۔ انھیں بہت عمدہ کپڑے پہننے یا اسی طرح کی دوسری باتوں میں بھی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بلراج ہر لحاظ سے ایک اچھے 'آریہ سماجی' لڑکے تھے۔ اطاعت شعار، فرض شناس، ہندی اور سنسکرت میں ماہر۔ پوری 'سندھیا' اور سارے 'ہون منتر' انھیں زبانی یاد تھے۔ وہ پرارتھنا پابندی سے کرتے تھے اور ہفتہ وار اجتماع میں بلاناغہ شریک ہوتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ان میں یہ وصف بھی تھا کہ وہ بزدلی اور بودے پن سے کوسوں دور تھے اور آنکھیں بند کرکے دوسروں کی مرضی پر چلنا انھیں پسند نہ تھا۔ وہ کٹھ پتلی نہیں بن سکتے تھے، بلکہ اپنی ہی مرضی اور اپنے ہی ارادے کے تابع رہتے تھے۔ وہ ایک باشعور لڑکے تھے، جس کا چہرہ دمکتا ہوا جاذبِ نظر تھا اور سیرت میں سب کو نظر آجانے والا خلوص رچا ہوا تھا۔

وہ میلانات جنھوں نے بعد میں بلراج کو انسان اور فن کار، دونوں حیثیتوں سے انفرادی شخصیت عطا کی، ان کے لڑکپن کے دنوں میں ہی نمایاں ہونے لگے تھے۔ وہ ڈرامے کے رسیا شروع سے ہی تھے۔ درسی کتابوں میں پڑھے ہوئے اشعار کے نمونے پر کبھی کبھی وہ سنسکرت میں شعر بھی موزوں کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور خصوصیت بھی آج تک مجھے متاثر کرتی ہے۔ ان کا جمالیاتی ذوق بہت منفرد قسم کا تھا، جس کا اظہار ان کی پسند اور ترجیح کے ذریعہ ہوتا تھا۔ ایسے اشعار فوراً ان کے دل میں اُتر جاتے جن میں ایک خاص قسم کی موزونی اور اتار چڑھاؤ ہوتا۔ ہَون وغیرہ کی رسم بھی انھیں اسی لیے پسند تھی۔

جب بلراج اسکول میں ہی پڑھ رہے تھے تو ہمارے خاندان میں موت کا ایک اور سانحہ ہوگیا۔ ہماری پانچ بہنوں میں سے دو ہی بہنیں زندہ بچی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام ساوتری تھا۔ پلوریسی کی بیماری کے ہاتھوں وہ بھی بھگوان کو پیاری ہوگئیں۔ مرتے وقت ان کی عمر 19 برس تھی۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھیں۔ زعفرانی رنگت۔ نرم گفتار، نرم خو۔ جس رات ان کا انتقال ہوا تو اپنا وقت قریب ہونے کا احساس غالباً انھیں پہلے سے ہی ہوگیا تھا، کیونکہ انھوں نے پتا جی اور ماتا جی، دونوں کو بلا کر ان سے وید کے منتر پڑھنے کی التجا کی تھی۔ پھر وید کے بھجن سنتے سنتے ہی ہماری بہن اس دنیا سے سدھار گئیں۔ جیسے ہی یہ پتہ چلا کہ اب وہ دنیا سے دامن چھڑا چکی ہیں، بھجن کا آہنگ بَین اور ماتم میں بدل گیا۔ مگر ان کی وفات کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے ہمارے سوگوار خاندان کو ایک خاص قسم

کے سکون اور ڈھارس کا احساس ہوا اور جس نے بلراج کے ذہن پر یقیناً دیر پا نقش چھوڑا ہوگا۔ ہوا یہ کہ ہماری بڑی بہن، جو شادی شدہ تھیں اور ان دنوں ہمارے یہاں ہی آئی ہوئی تھیں، ساوتری بہن کے گزرنے کے بعد چند منٹ کے اندر ہی وہ دوسرے بچّے کی ماں بن گئیں۔ اس مرتبہ ان کے لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ ہماری ماں، جو کچھ دیر پہلے اپنی مرتی ہوئی بیٹی کی تیمار داری کر رہی تھیں، فوراً اپنی دوسری بیٹی کی دیکھ بھال کرنے کے لیے لپکیں جو زچگی کا درد سہہ رہی تھی۔ جب لڑکی پیدا ہوئی تو سب نے یہی کہا کہ ہماری مری ہوئی بہن نے پھر اسی خاندان میں جنم لے لیا ہے۔ شاید یہ بات صرف بچوں کو تسلی دینے کی خاطر کہی گئی ہوگی۔

1928 میں بلراج نے ڈی اے وی اسکول سے میٹرک کا امتحان دیا۔ سائنس اور سنسکرت ان کے اختیاری مضامین تھے۔ انھوں نے اس امتحان میں شان دار فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ پورے ضلع میں ان کا مقام دوسرا رہا اور انھیں یونیورسٹی اسکالرشپ کا حق دار ٹھہرایا گیا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد انٹر کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بلراج ڈی اے وی کالج، راولپنڈی میں داخل ہو گئے۔ یہاں سنسکرت اور فلسفہ ان کے اختیاری مضامین تھے۔ ان دنوں طالب علم کے لیے کالج کا مطلب مغربی افکار اور مغربی قدروں سے متعارف ہونا تھا۔ (بڑی حد تک آج بھی یہی حال ہے)۔ کالج کے نصاب میں انگریزی کو اوّلیت کا درجہ حاصل تھا، اور چونکہ یہ زبان وقار اور برتری کی علامت بنی ہوئی تھی، اس لیے کالج کی تعلیم کا یہ مفہوم بھی نکلتا تھا کہ اس سے طالب علم کے اندازِ نظر اور طرزِ زندگی میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوگی۔ پتلون پہننا، انگریزی وضع کا لباس اپنانا، انگریزی میں بات چیت کرنا، انگریزی فلمیں دیکھنا، مونچھیں صاف کرانا، نئے اسٹائل کے بال رکھنا، انگریزی فکشن پڑھنا وغیرہ ــــ یہ سب کالج کی تعلیم میں مضمر طور پر شامل تھے۔ اس کے ساتھ کالج کی تعلیم سے یہ مراد بھی تھی کہ طالبِ علم روایتی ہندوستانی افکار اور کلچر، رسموں اور رواجوں، دستوروں اور تقریبوں سے دور ہوتا جائے گا اور ان کے لیے اپنے دل میں ایک قسم کی کراہیت کا احساس پیدا کرے گا۔

اس مرحلے پر بلراج کی زندگی میں ایک صاحب وارد ہوئے، جن کا نام جسونت رائے تھا، اور جنھوں نے بعد میں بلراج کی زندگی پر زبردست اثر ڈالا۔ جسونت رائے کالج میں بلراج کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ بہت خوب رو شخص تھے۔ ذہن بہت حسّاس پایا تھا۔ ادب سے انھیں حقیقی لگاؤ تھا۔ زندگی اور سماج کے لیے ان کا نقطۂ نظر روشن خیالی پر مبنی تھا۔ سچ مچ ان کی شخصیت بہت

دل نواز اور پُرکشش تھی۔ لیکن شاید ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ لٹریچر کے ایسے استاد تھے کہ طالب علموں میں اُمنگ اور ولولہ جگا دیتے تھے۔ ساری طالب علم برادری ان کی پرستار تھی۔ ہر روز جب وہ کالج سے گھر واپس جاتے تو ان کے ہاتھ میں گل دستہ ضرور ہوتا۔ یہ پھول انھیں ان کے شاگرد پیش کیا کرتے تھے۔ طلبا ان کا اس قدر ادب اور احترام کرتے تھے کہ کلاس روم میں ان کے آنے سے پہلے ہی مکمل خاموشی چھا جاتی تھی — ایسی خاموشی کہ سوئی بھی گرے تو آواز سنائی دے جائے! جب وہ شیلے کی 'ODE TO A SKYLARK' یا کسی اور نظم کے اشعار کی تشریح بیان کرتے، اس کے چھپے ہوئے حسن پر سے پردہ اُٹھاتے اور حقیقی زندگی سے واردات کے حوالے دے کر اپنے بیان کو تاثیر کا طلسم بنا دیتے تو طلبا مسحور ہو جاتے تھے۔ شاعری کا جمالیاتی اثر ان کی دل نشیں تشریح سے اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ بلراج کی طرف وہ اتنی ہی تیزی سے مائل ہوئے جتنی تیزی سے بلراج ان کی طرف کھنچ گئے تھے۔ شام کو جسونت رائے لمبی چہل قدمی پر نکلتے تھے تو کچھ قریبی، مدّاح شاگرد ان کے ساتھ ضرور ہوتے تھے۔ بلراج جلد ہی ان کی 'ہم قدم ٹولی' میں شامل ہو گئے۔ یہ سب کے سب کبھی کبھی چھاؤنی کا رُخ کر بیٹھتے۔ وہاں جے۔ رے اینڈ سنز کی کتابوں کی دکان پر پہنچ کر ان کی چہل قدمی کا دور تمام ہو جاتا۔ جسونت رائے نئی آنے والی کتابوں پر نظر دوڑاتے اور انگریزی کی چند کتابیں خرید کر ہی دکان سے نکلتے۔ واپسی کے راستے میں دو سینما ہال عارضی پڑاؤ بنتے۔ وہاں مغربی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ان فلموں کی نمائشی تصویروں کا سرسری جائزہ لیا جاتا۔ نوجوان ہندوستانی طلبا کی نظر میں چھاؤنی مغربی کلچر کا مرکز تھی۔ چمکتی دمکتی، سجی سجی دکانیں، صاف ستھری ہموار سڑکیں، گوری، سنہرے بالوں والی برطانوی یا اینگلو انڈین عورتیں، یونیفارم پہنے ہوئے برطانوی فوجی متر گشتی کرتے ہوئے۔ ہندوستانی طلبا کے لیے چھاؤنی کی سیر گویا مغربی طرزِ زندگی کی جھلک دیکھ لینے کے برابر تھی۔ یا پھر جسونت رائے اپنے چیلوں کو (جنھیں مذاق میں جسونت رائے کی 'وانر سینا'، یعنی 'بندر سینا' کہا جاتا تھا) دیہاتی علاقے کی لمبی سیر کرانے کے لیے لے جاتے تھے۔ شہر کے پار کھیتوں سے ہوتے ہوئے وہ دور تک نکل جاتے تھے۔ ہنسی، قہقہے، چہچہے، لطیفے، پُرلطف واقعات کا بیان، بحث و مباحثہ — سارے رنگ اس سیر میں شامل ہوتے تھے۔

گھر میں جسونت رائے ایک بڑے کنبے کے ساتھ رہتے تھے، جن میں ان کے جوان جوان بھائی بھی شامل تھے۔ پورے خاندان کے لیے رہنے کا ٹھکانا ان کے باپ نے فراہم کیا تھا جو ایک

ممتاز ڈاکٹر تھے۔ اِس گھر کی فضا اُس فضا سے یک سر مختلف تھی جس میں بلراج اب تک رہتے اور سانس لیتے رہے تھے۔ یہاں نہ مذہبی جوش خروش تھا، نہ سماجی بندشیں۔ یہ خوش حال، خوش پوش اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا گھرانہ تھا۔ یہاں سب کے سب عیش کی زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ خاندان چونکہ کافی بڑا تھا، اس لیے گھر میں ہر وقت قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ مہمان نوازی اس خاندان کی امتیازی خصوصیت تھی۔ روزانہ گھر میں گوشت کے مختلف کھانے تیار ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے بہت سے مسلمان دوست بھی تھے، جن کے ساتھ ان کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ یہ مسلمان دوست ان کے ساتھ ہی گھر کے اندر اُٹھتے بیٹھتے تھے، ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر کی عورتیں بھی ان سے کوئی پردہ نہیں کرتی تھیں۔

یہ ساری باتیں بلراج کے لیے بالکل نئی تھیں۔ ان کے زیرِ اثر بلراج کا ذہنی اُفق وسیع تر ہونے لگا اور ان کا اندازِ نظر بدلتا گیا۔ آریہ سماج میں بلراج کی حاضری پہلے کے مقابلے میں کم ہونے لگی۔ دہون، اور پرارتھنا کا سلسلہ تو لگ بھگ بالکل ہی موقوف ہو گیا۔ بلراج مغربی فلمیں بھی دیکھنے لگے، جو پہلے ان پر تقریباً حرام تھیں۔ وہ گوشت بھی کھانے لگے، جو اب بھی ہمارے گھر میں نہیں پکتا تھا۔ ان کے لباس میں پاجامے کی جگہ پینٹ نے لے لی۔ ان کے زور دینے پر گھر میں ڈائننگ ٹیبل بھی آ گئی (پہلے ہم رسوئی گھر میں ہی بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے)، جاپانی ٹی سیٹ بھی منگوا لیا گیا۔ چائے گھر میں اکثر بننے لگی۔ خشخشی بالوں کے درمیان جھولتی ہوئی چوٹی کی جگہ بلراج کے سر پر نئے اسٹائل کے بال جلوہ گر رہنے لگے۔ اور پھر جلد ہی بلراج گھر میں انگریزی میں بات چیت بھی کرنے لگے، جس سے سب سے زیادہ اُلجھن ماتا جی کو ہوتی تھی، کیونکہ ان کی سمجھ میں خاک نہیں آتا تھا کہ ان کا بیٹا کیا کہہ رہا ہے۔ تاہم بلراج کی یہ روش نہ انوکھی تھی، نہ بے موقع اور نہ ناگوار۔ ان دنوں کالج میں پڑھنے والا ہر طالب علم نے یہی چلن اختیار کر رکھا تھا۔ تاہم اس نئی روش کے ہاتھوں بلراج اپنی تہذیبی جڑوں سے محروم نہیں ہوئے۔ ہاں، اس زبردست چھاپ کی بدولت ان کی نظر میں وسعت اور ذہن میں آزاد خیالی ضرور پیدا ہوئی، لٹریچر کو پرکھنے، سراہنے کی حس ضرور تیز تر ہوئی۔ وہ کسی حد تک اس سخت کوشی اور قدامت پرستی سے بھی دامن چھڑانے لگے جس کے آغوش میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔

بلراج کے لیے دور رس اہمیت کا حامل ایک اور موقع وہ تھا جب 1929 میں لاہور میں راوی کے کنارے انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ بلراج اپنے کچھ دوستوں کے

ساتھ اس اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے لاہور پہنچے اور جب واپس آئے تو جوش اور ولولے سے سرشار تھے۔ کئی دن تک وہ آنکھوں دیکھی بیان کرتے رہے: مکمل آزادی کے لیے عہد کرتے ہوئے لوگوں کا بے پناہ مجمع، جواہر لال نہرو، جو ہندوستانی نوجوانوں کی پرجوش عقیدت کا مرکز تھے اور جنھیں بلراج نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ قومی پرچم کے سائے میں رقص کرتے دیکھا تھا۔ اس اجلاس کے ذریعہ وقت کی ان زبردست لہروں سے بلراج کا رابطہ پیدا ہوا تھا جو ہماری قوم کی تقدیر کی تشکیل میں مصروف تھیں، اس لیے وطن پرستی کا جذبہ ان پر نشہ بن کر چھاگیا تھا۔

اس اجلاس کے ایک آدھ سال بعد بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی اور اندھیرے کی گود میں ان کے خاکی جسم کی آخری رسوم چپ چاپ ادا کر دی گئیں۔ اس پر سارے ہندوستان میں برہمی کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ بلراج کے دل پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اس شہید کی موت پر انھوں نے انگریزی میں ایک نظم لکھ کر اپنے دل کا غبار نکالا۔ یہ پوری نظم مجھے آج بھی زبانی یاد ہے۔ ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

آنسوؤں کے درمیان آہ و فغاں
لوگ ہیں ماتم کناں
نوحہ خوانی اس کے لیے جو چھپ گیا ہے موت کی آغوش میں
چھوڑ کر ان کو یہاں
میں ہوں لیکن شادماں
آہ کے ہمراہ دل سے یہ نکلتی ہے صدا:
تو جو صحنِ ہند میں پت جھڑ کی رُت کا پھول تھا
تو جو زنجیروں کا بیٹا تھا، تجھے
مل گئی طوقِ غلامی سے نجات
کتنا خوش قسمت ہے تو!
تو جیا جب تک لہو تیرا یہاں بہتا رہا
تو شکنجوں میں یہاں جکڑا رہا
اب مگر آزاد خطّوں کی بلندی میں تری بے قید روح
چین سے اُڑتی پھرے گی بے گماں

اب تجھے دامِ غلامی کر نہیں سکتا اسیر
کوئی زنجیرِ ستم تجھ تک نہ پہنچے گی وہاں

ہاں، مجھے اک بات کا غم ہے مگر
کاش اپنی پاک دھرتی پر مجھے دو گز زمین
ایسی مل جائے جہاں ساری فضا آزاد ہو
اور تیرے بے نشاں، آفت رسیدہ باقیات
چین سے آرام فرما ہوں وہاں
آہ، لیکن ایں خیال است و محال است و جنوں
تو تھا اک عاجز غلام
ہے آرام و سکوں کی آرزو عاجز غلاموں کے لیے ؟

یاد رکھنا، میرے بچھڑے بھائی، میری ایک بات
روح کو تیری اگر ربِّ عظیم
پھر زمیں پر بھیجنے کا حکم دے
التجا کرنا، کسی ویران ریگستان میں
عمر ہو تیری بسر
آخر ایسی سرزمیں پر کیوں دوبارہ ہو جنم
ہے جہاں ٹھنڈا جوانوں کا لہو
اور عزّت کوڑیوں کے مول بکتی ہے جہاں
خوں بہاتے ہیں جیالے سورما
اور ان کا ہم نوا کوئی نہیں
کون ان کے زخم پر مرہم رکھے ؟
کون ان کا دل بڑھائے
کھود ڈالی جاتی ہیں قبریں جہاں

اور ان پر ہل چلا کر گم کیا جاتا ہے ان کا ہر نشاں
ہے جہاں دستور کہ آنسو بہیں تو غیر ملکی رنگ کے آنسو بہیں
گیت گاتے ہیں کوے پنجرے میں بند
جیل کے پنچھی جہاں رہتے ہیں اس دُھن میں مگن
زندگی بھر ڈھالیں فولادی سلاخیں خود ہی اپنے واسطے !

جذبات کی شدّت اور تندی اس پوری نظم میں رچی ہوئی ہے۔ ہندوستان کو برطانیہ کی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد کس طرح بلراج کے شعور کو جھنجھوڑ رہی تھی، اس نظم میں صاف نمایاں ہے۔ جسونت رائے کے اثر کے تحت بلراج اس روایتی، تنگ، قدامت پرستانہ حصار سے اپنا دامن چھڑا رہے تھے جس کے اندر وہ شروع سے ہی سانس لیتے آئے تھے۔ ادھر قوم پرستانہ اُمنگوں کی طوفانی لہریں انھیں ذہنی اور جذباتی طور پر اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ یہ دور ان کے لیے بلاشبہ ذہنی افق کے وسیع تر ہونے کا دور تھا۔

جو نئی نئی باتیں بلراج کر رہے تھے یا جن کی شروعات ان کی وجہ سے گھر میں ہو گئی تھی، ان میں سے اکثر پتاجی کی مرضی اور مزاج کے خلاف تھیں، لیکن بلراج کو وہ ہمیشہ کافی ڈھیل دیتے رہے، ہمیشہ ان پر محبت اور شفقت نچھاور کرتے رہے۔ بلراج پر اپنے آپ کو مسلط کرنے کی کوشش انھوں نے کبھی نہیں کی۔ بلراج کی نیک نیتی اور دیانت داری پر ان کو پورا اعتماد تھا، اگرچہ اس اعتماد کا اظہار ضروری نہ تھا۔ پتاجی کی تاکید تھی کہ ہم صبح کو جلد اُٹھا کریں اور سیر کے لیے نکل جانا ہمارا سب سے پہلا کام ہو۔ ہم اس معمول کی پابندی بھی کرتے تھے۔ مگر اب بلراج صبح کو دیر سے اُٹھنے لگے تھے۔ وہ بستر پر پڑے رہتے۔ سر کے نیچے تکیے کو دوہرا کر کے رکھ لیتے اور کوئی ناول پڑھتے رہتے۔ یہ حرکت پتاجی کو بالکل پسند نہ تھی۔ مگر بلراج کو دیکھ کر پتاجی مذاق میں صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جاتے : "لندن پہنچے ہوئے ہو ؟" اصل بات یہ تھی کہ پتاجی کو جسونت رائے بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اُن کے بیٹے پر جسونت رائے کا اثر اچھا ہی پڑے گا۔ خود جسونت رائے میں یہ بے مثال وصف تھا کہ وہ بڑوں کو بھی اتنی ہی آسانی سے اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے جتنی آسانی سے چھوٹوں کو۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں خاندان کے جھگڑوں میں ان سے مشورے طلب کرتی تھیں، نوجوان جوڑے اور نئی عمر کے طلباء ان کی رہنمائی سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ایک بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ وہ اُلجھن

میں گھرے ہوئے شخص کو مطمئن کرنے اور الجھنوں کو دور کرنے کی راہ کسی نہ کسی طور نکال ہی لیتے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر تو ان کے اثر آفریں بول دکھی دلوں کے لیے سکون بخش مرہم بن ہی جاتے تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ بیچ کی راہ سب سے اچھی راہ ہوتی ہے اور اپنی زندگی میں انھوں نے 'خیرالامور اوسطہا' کے اصول کو ہی اپنا رکھا تھا۔ ایک حکیمانہ قول جو انھیں بہت پسند تھا اور جس کا حوالہ وہ بار بار دیا کرتے تھے، یہ تھا: "بس اس حد تک۔ اس سے آگے ہرگز نہیں۔" ان کا کہنا تھا کہ یہ قول ان کے لیے ضابطۂ عمل کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے دوست اس بنا پر انھیں چھیڑا بھی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اسی ضابطۂ عمل کا اثر ہے کہ جسونت رائے ہمیشہ بیچ سڑک پر چلتے ہیں، مونچھیں صاف کرنے یا باضابطہ مونچھیں رکھنے کی جگہ تتلی جیسی مونچھیں رکھتے ہیں، کھادی پہنتے ہیں، مگر ایسی کھادی جو ہاتھ سے کاتے ہوئے سوت کی اور ہاتھ سے بُنی ہوئی نہیں ہوتی، بلکہ مل کی تیار کردہ ہوتی ہے، کانگریس کی تحریک کو سراہتے ہیں، لیکن اس میں شامل نہیں ہوتے، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ جسونت رائے ان دنوں کے آزاد خیال دانشور کا مثالی پیکر تھے — قدامت پرستی کے خلاف، مگر رویّہ اور اندازِ نظر ہیں انقلابی شان سے محروم، عمل سے زیادہ گفتار کے غازی۔ یہی سبب تھا کہ وہ قومی جذبے اور قومی اُمنگوں کو دل کھول کر سراہتے تھے، مگر عملی جدوجہد سے دور ہی رہتے تھے۔

ایک دن ایک پولیس افسر ہمارے یہاں آدھمکا۔ پولیس کا دستہ اس کے ساتھ تھا اور ہمارے گھر کی تلاشی لینے کا پروانہ اس کے ہاتھ میں۔ پتا جی کے لیے تو یہ ہوش اُڑا دینے والا تجربہ تھا۔ تین دن تک تلاشی جاری رہی، لیکن ایسی کوئی شے برآمد نہ ہو سکی جس کی بنا پر بلراج کو ملزم ٹھہرایا جا سکے۔ آخر تلاشی کا دور تمام ہوا اور بلراج کی گرفتاری کا وارنٹ واپس لے لیا گیا۔ اس ساری گڑبڑ کی وجہ بلراج کی ایک چھوٹی سی شرارت تھی۔ انھوں نے ہماری رشتے کی بہن اُرملا شاستری کو، جو میرٹھ کی معروف کانگریس لیڈر تھیں، ایک خط میں کہیں یہ لکھ دیا تھا کہ دو بم منگوانے کے لیے آرڈر دے دیا گیا ہے اور یہ بم جلد ہی ہمارے یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہندی، اردو میں بم کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک تو بارود کا بم اور دوسرا تانگے کا بم۔ بلراج کی مراد تانگے کے بم سے تھی۔ ہمارے یہاں ان دنوں تانگہ موجود تھا اور پتا جی نے اس کے لیے دو نئے بم منگوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی، مگر یہ مذاق ہمارے خاندان کو بہت مہنگا پڑا، کیونکہ ایک موقع پر تو سچ مچ یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ بلراج کو جیل میں ڈال دیا جائے گا۔

چراغ نیلے گگن کے ـــ کتنی ہے شب سہانی!

گھڑی ہو ایسی تو میری وحشت نکال دیتی ہے مجھ کو گھر سے
قدم بڑھاتا ہوں سہمے سہمے، چمکتی شبنم کے ڈھیر کی سمت
جہاں میں بیٹھا، ستاروں سے خائف اور لرزاں
تکے ہی جاتا ہوں نیلی وسعت کی جھلملاتی سی روشنی کو

بلراج نے وزن و آہنگ کا گہرا شعور پایا تھا۔ ان کا تخیل شہ زور اور بلند پرواز تھا، احساس میں بے پناہ شدت تھی۔ اچھے فن کار کی اِن تینوں لازمی خصوصیتوں سے وہ مالا مال تھے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ وہ کتابوں میں ہی گم رہتے تھے یا ان کا ذہن ہر وقت سوچ بچار اور تصوّر میں کھویا رہتا تھا۔ وہ ایسے کتابی کیڑے ہرگز نہ تھے کہ کہیں کسی الگ تھلگ گوشے میں گھنٹوں بیٹھے کتابیں پڑھتے رہیں۔ اس کے برعکس وہ بے حد ملنسار، دوستوں کی صحبت کے رسیا اور مہم جوئی کے شوقین تھے۔ وہ دروں بیں نہ تھے۔ اپنی ذات سے زیادہ انھیں باہر کی دنیا میں دلچسپی تھی۔ وہ بہت اچھے کھلاڑی نہ سہی، مگر کھیلوں اور کھلی ہوا کی زندگی کے شیدائی ضرور تھے۔ اسکول اور کالج میں ان کا محبوب مشغلہ یہی تھا کہ چند دوستوں کو گھیریں اور ان کے ساتھ سائیکل پر یا پیدل لمبی سیر کو نکل جائیں۔ کسی روز وہ اعلان کر بیٹھتے: "آؤ، سائیکلوں پر مری چلیں"۔ یہ تجویز ذرا عجیب و غریب اور کسی حد تک ترنگ کی دلیل نظر آتی تھی، کیونکہ مری کا پہاڑی مقام راولپنڈی سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر بلراج کی نگاہ میں فاصلوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ اپنی سائیکل سنبھال کر بے نیازی کے ساتھ اپنی مہم پر روانہ ہو جاتے۔ اکثر وہ روپے پیسے یا کھانے پینے کی چیزوں کا بھی بندوبست نہ کرتے۔ ان کے ساتھ کیے ہوئے ایسے کئی بے سر و ساماں سفر مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ مری سے کوہالہ، سری نگر سے گلمرگ، راولپنڈی سے مری، وغیرہ کتنے ہی دورے میری یادوں میں محفوظ ہیں۔ بلراج کو کوئی پہاڑی دکھائی دیتی تو وہ اس پر چڑھنے کے لیے مچل اٹھتے۔ کسی جھیل پر ان کی نظر پڑتی تو اُسے تیر کر پار کرنے کو بے تاب ہو جاتے تھے۔ دراصل یہ ان کا فطری مزاج تھا۔ ان پرانے دنوں میں بھی ان کے ذہن کی بے قراری کافی نمایاں تھی۔ میرا خیال ہے انھوں نے اپنی زندگی کے دو متواتر دن بھی ایک ہی ڈھنگ سے نہیں گزارے ہوں گے۔ میز پر جم کر لکھنا

اپنی پود کے دوسرے نوجوانوں کی طرح بلراج بھی دوہرے اثر کے سائے میں پل بڑھ رہا تھا۔ ایک اثر آزادی کی جدوجہد کا تھا، دوسرا مغربی افکار اور کلچر کا۔ جب جواہر لال نہرو سیاست کے آسمان پر شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوئے تو تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ان کی فوری مقبولیت کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا۔ قومی اُمنگیں بھی بلراج میں اتنا ہی جوش خروش پیدا کر دیتی تھیں جتنا انگریزی ادب کا مطالعہ۔ اس لیے اگر انھوں نے "غیر ملکی رنگ میں آنسو بہانے" کا ذکر کیا تھا تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ جسونت رائے کے اثر کے تحت وہ "آزاد خیالی" کا مسلک اختیار کر چکے تھے۔ لیکن یہ آزاد خیالی زیادہ متحرک، زیادہ پُرزور، زیادہ عملی تھی۔

لگ بھگ ان ہی دنوں بلراج نے انگریزی میں ایک اور نظم لکھی، جس کے چند بند مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ اس نظم میں اندازِ بیان زیادہ منجھا ہوا ہے۔ بندشِ الفاظ زیادہ چُست اور احساس زیادہ باریک بیں ہے۔ نظم کا پس منظر وادیِ گل مرگ (کشمیر) ہے، جہاں تاریکی کے سائبان تلے پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں اور کسانوں کے گھروں کی روشنیاں یہاں وہاں بکھری ہوئی ہیں:

سکوت —— بے پایاں، غیر ارضی سکوت ہے ہر طرف مسلّط
مگر کہیں دور تند و سرکش تڑپتی لہریں گرج رہی ہیں
ہوں جیسے قسمت کے ہیٹے، بے آس دل کے مارے
کبھی نہ ملنے کو جو دوبارہ، بچھڑ رہے ہوں

حسین، دل کش پہاڑیوں سے کبھی اب ان کا ملن نہ ہوگا
کبھی وہ شان و شکوہ سے اب رواں نہ ہوں گی
اسی طرح شب کو پتھروں کی قدیم، سفاک تہہ سے اُٹھ کر
ہمیشہ دم توڑتی رہیں گی

ہر ایک تنہا دیے کے دل میں صدف چھپا ہے
پناہ لیتی ہیں آدمی کی مسرتیں یا ملال جس میں
مرے پیچھے ہیں دامن میں رات کے صرف ماہ و انجم

پڑھنا انھیں پسند نہ تھا۔ لگے بندھے معمول سے وہ جلد ہی بیزار ہو جاتے تھے۔ جزوی حد تک روح کی یہ بے قراری ہی شاید بعد میں اس بے صبری اور جلد بازی کا سبب بنی جس کا اظہار بلراج نے زندگی میں بار بار کیا۔ جب بھی اندازِ زندگی میں لگے بندھے معمول کی بے کیفی کا رنگ جھلکنے لگتا، بلراج کسی اور راہ پر چل کھڑے ہوتے۔ اسی اضطرابی کیفیت کے باعث وہ کسی مستقل روزگار، ملازمت یا پیشے سے کبھی وابستہ نہیں ہوئے، جس میں ان کی زندگی کے بہت سے برس ایک ہی انداز میں گزرتے چلے جاتے۔ سیماب صفت ہونے کے ساتھ وہ بے باک اور نڈر بھی تھے۔ روایت پرستی سے وہ ہمیشہ دور رہے۔ جو کچھ وہ کہتے اور کرتے تھے، اس میں وہ تازگی، وہ ندرت، دوسروں کے سہارے سے بے نیاز روح کی وہ آزادی ضرور جھلکتی تھی جو ان کی ذات کا حصّہ تھی۔ دوست بنانے کی تو ان میں بے پناہ صلاحیت تھی۔ ہر دور میں ان کے ایک جگری دوست اور درجنوں ساتھی ضرور رہے۔ یہاں ایک عجیب بات پر میرا دھیان جاتا ہے۔ ان کے جگری دوست جتنے بھی رہے، سب کے سب بہت سانولے رنگ کے تھے۔ مثلاً اسکول کے دنوں میں گرجا، کالج کے زمانے میں پریم کرپال، اپٹا کے دور میں راما راؤ۔ اس کے علاوہ بلراج کی زندگی میں کوئی نہ کوئی شخص ایسا بھی ہمیشہ رہا جو ان کا آدرش بن سکے، جس سے وہ رہ نمائی پا سکیں، جس کی مثال کی وہ پیروی کر سکیں۔ بلراج کی نوجوانی کے دنوں میں یہ منصب جسونت رائے کو حاصل رہا، بعد کی عمر میں پی۔ سی۔ جوشی کو۔

اپریل 1930 میں بلراج نے انٹر کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس ہوئے۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے انھوں نے لاہور کا رُخ کیا۔

2

لاہور میں

مزید تعلیم کے لیے بلراج کے لاہور جانے کا وقت قریب آیا تو ہمارے گھر میں اچھی خاصی ناٹک جیسی فضا پیدا ہو گئی۔ 1930 میں بلراج نے مقامی ڈے اے وی کالج سے انٹر پاس کر لیا تھا۔ مزید تعلیم کے لیے ان کو لاہور جانا ہی تھا، جو ان دنوں اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز اور پنجاب یونیورسٹی کا مقام وقوع تھا۔

پتا جی کی رائے یہ تھی کہ بلراج کامرس پڑھیں اور اس کے لیے لاہور کے ہیلی کالج آف کامرس میں داخلہ لیں۔ کیونکہ وہ خود بزنس مین تھے، اس لیے اپنے دونوں بیٹوں کے لیے بھی کاروباری کیریر کا ہی تصور باندھے ہوئے تھے۔ ایسے کیریر کے روشن امکانات بیان کرتے وقت وہ اپنا پورا زورِ خطابت صرف کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا: "امپورٹ کے کاروبار کے لیے راولپنڈی مناسب جگہ نہیں ہے۔ میں تو یہی چاہوں گا کہ میرا ایک بیٹا لندن میں آفس قائم کرے، دوسرا بیٹا کراچی میں۔ ایک بھائی سپلائی کا کام سنبھالے، دوسرا آرڈر حاصل کرنے کا۔ اصل امپورٹ بزنس تو اسی صورت میں ہوگا۔ عقل مند کہہ گئے ہیں کہ اگر مٹھی بھر مٹی لینا ہی ہے تو بڑے ڈھیر میں سے لو، چھوٹے ڈھیر میں سے نہیں۔"

مگر بلراج کو کامرس میں کچھ ایسی دل چسپی نہ تھی۔ اور اس سے بھی کم دل چسپی انھیں ہیلی کالج آف کامرس میں داخلہ لینے میں تھی، جو مشہور زمانہ گورنمنٹ کالج اور فورمین کرسچین کالج وغیرہ کے مقابلے میں لاہور کا ایک غیر معروف سا ادارہ تھا۔ ان دنوں طلبا کے لیے، خاص طور سے چھوٹے شہروں سے آتے ہوئے طلبا کے لیے کالج کا نام جتنا اہم تھا، کورس یا نصاب اتنا اہم نہ تھا۔ گورنمنٹ کالج اور فورمین کرسچین کالج کا اپنا الگ گلیمر تھا، جس سے باقی سارے کالج قطعی محروم تھے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ جسونت رائے، جو بلراج کے لیے پیر و مرشد کا درجہ رکھتے تھے، فورمین کرسچین کالج کے پڑھے ہوئے تھے اور ان دنوں کالجوں میں طلبا جیسی

زندگی گزارتے تھے ۔ اس کے بارے میں ان گنت کہانیاں بلراج کو سنا چکے تھے ۔ پھر بلراج کا ذہن بھی ادب کی طرف مائل تھا ۔ کامرس سے ان کی طبیعت کو ذرا سی بھی مناسبت نہ تھی ۔ تاہم پتا جی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے لاہور پہنچنے کے بعد انھوں نے ہیلی کالج آف کامرس میں داخلے کے لیے درخواست دے ہی دی ۔

بلراج جب راولپنڈی سے روانہ ہوئے تو پتا جی نے انھیں اپنے کئی دوستوں کے نام خط لکھ کر دیے ، جن میں دوستوں سے گذارش کی گئی تھی کہ بلراج کی مدد اور رہنمائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں ۔ ایک ایسا ہی خط انھوں نے ڈی اے وی کالج ، لاہور کے پرنسپل لالہ سین داس کو لکھا تھا جو ممتاز ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ آریہ سماج کے لیڈر بھی تھے ۔ کامرس کالج میں داخلے کی درخواست دینے کے بعد بلراج لالہ سین داس کے پاس پہنچے ۔ انھوں نے لالہ جی کو بتایا کہ وہ کامرس پڑھنے کے قطعی آرزو مند نہیں ہیں ۔ پھر انھوں نے لالہ جی سے التجا کی کہ پتا جی سے ان کی طرف سے بات کر دیجیے اور کسی طرح انھیں اس امر پر آمادہ کریں کہ وہ (بلراج) کسی اور کالج میں داخلہ لے کر کوئی معمول کا ڈگری کورس مکمل کریں ۔ بلراج کو توقع کے برعکس لالہ سین داس کے روپ میں ایک ہمدرد فرشتہ مل گیا ۔ انھوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس سلسلے میں پتا جی کو ضرور لکھیں گے ۔ مزید تعجب بلراج کو اس وقت ہوا جب پتا جی کا جواب جھٹ پٹ آ گیا ۔ انھوں نے لکھا کہ اگر بلراج کامرس نہیں پڑھنا چاہتے تو ایگری کلچر کا کورس لے لیں ۔ اس کے لیے وہ امرتسر کے ایگری کلچر کالج میں شوق سے داخل ہو جائیں ۔ دراصل روزگار کے ضمن میں پتا جی کی ترجیحوں کی ترتیب اسی طرح تھی ۔ اوّلیت کامرس کو حاصل تھی ۔ اس کے بعد ایگری کلچر کا نمبر آتا تھا ۔ ان کا خیال تھا کہ زراعت بھی آزادی کی زندگی اور روشن تر امکانات کی ضامن ہوتی ہے ۔ ملازمت کا پیشہ پتا جی کو سخت ناپسند تھا ۔ وہ ایک زمانے میں خود بھی ملازمت کر چکے تھے اور اپنے تجربے کی بنا پر ملازمت کو نہایت بے فیض اور لچر شے سمجھتے تھے ۔ چنانچہ بلراج امرتسر چلے گئے اور وہاں داخلے کی درخواست دے دی ۔ مگر ان کا دل تو لاہور میں اٹکا ہوا تھا ۔ گورنمنٹ کالج میں داخلے کا وقت نکلا جا رہا تھا ۔ جب داخلے کا وقت ختم ہونے کو ہی تھا تو بلراج نے ایک بار پھر لالہ سین داس کے در پر دستک دی اور اشتیاق اور احتجاج سے معمور لہجے میں کہنے لگے " پتا جی تو میری زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ میں ایگری کلچر کالج میں قطعی نہیں جانا چاہتا ۔ آخر انھیں وہاں مجھے داخلہ دلانے کا اتنا ارمان کیوں ہے ؟ "

اسی لمحے ساری الجھنیں ختم ہو گئیں ۔ لالہ جی نے بلراج کو دلاسا دیتے ہوئے کہا " کوئی بات

نہیں۔ تم جس کالج میں چاہو داخلہ لے لو۔ تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ذہن کو پُرسکون رکھو۔ میں تمھارے پتاجی کو سمجھا کر سارا معاملہ ٹھیک کر لوں گا۔"

اس طرح اکتوبر 1930 میں بلراج نے گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا، جہاں اگلے چار برس تک انھیں بی۔ اے (آنرز) اور ایم۔ اے (انگلش) کے لیے پڑھائی جاری رکھنا تھی۔

اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ کالج، لاہور، دوسرے کالجوں سے بہت حد تک الگ اور مختلف تھا۔ وہ ان چند کالجوں میں سے ایک تھا جو ہندوستان میں اس وقت کی برطانوی حکومت کی براہ راست نگرانی میں چل رہے تھے۔ شان دار عمارت، کشادہ سبزہ زاروں اور کھیل میدانوں اور بہت سے انگریز استادوں سے لیس یہ کالج سماجی وقار کے معاملے میں گویا حرفِ آخر تھا۔ اسپورٹس میں اسے نمایاں مقام حاصل تھا۔ صوبے بھر کے بہترین طلبا اس کی طرف بے اختیار کھنچے چلے آتے تھے۔ برطانوی ہند کی تمام بڑی بڑی انتظامی اور فوجی ملازمتوں کے لیے یہ بھرتی کے مرکز کا کام کرتا تھا۔ ان دنوں جس شخص کو بھی کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہونے کا ارمان ہوتا، اس کے لیے تعلیم حاصل کرنے کا مناسب ترین مقام گورنمنٹ کالج تھا۔ گورنمنٹ کالج کی ڈگری ایسی شاہ کلید سمجھی جاتی تھی جس سے سارے دروازے کھل جاتے ہیں، گورنمنٹ کالج کے بہت سے لیکچرر کیمبرج اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے، اس لیے وہاں کی فضا ہی انگریزی ہو گئی تھی۔ انگلستان میں لباس کا جو جدید ترین فیشن شروع ہوتا، اسے گورنمنٹ کالج تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ اکتوبر کے مہینے میں بہت سے انگریز لیکچرر گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے بعد انگلستان سے واپس آتے تھے تو اس وقت جو لباس وہ پہنے ہوتے تھے، اگلے برس کے لیے وہی فیشن بن جاتا تھا۔ لڑکے فوراً دوڑے دوڑے درزیوں کے پاس پہنچتے تھے، تاکہ جدید ترین تراش کے سوٹ سلوا سکیں۔ گورنمنٹ کالج کے طلبا اسمارٹ قسم کے کپڑے پہنتے تھے، انگلش گیت گاتے تھے، اپنے استادوں کے خیر مقدم کے لیے بالکل انگریزوں کے انداز میں اپنے سولا ہیٹ اُتار کر تعظیم دیتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ انگریزی طور طریقے اور انداز اختیار کرنے کی ہی دھن میں رہتے تھے۔ ہندوستانی طالبِ علم کے لیے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کرنا ایسا ہی تھا جیسا چھوٹے پیمانے کے انگلستان میں تعلیم حاصل کرنا۔

ہندوستان میں ان دنوں بے اطمینانی اور اضطراب کی لہریں پھیل رہی تھیں، گاندھی جی کی چلائی ہوئی سول نافرمانی کی دوسری تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ لندن میں گول میز کانفرنس کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ دہشت پسندوں کی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں۔ نوجوان وطن پرست تیزی سے

ان کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ گورنمنٹ کالج سے بس اتنے فاصلے پر جہاں تک پتھر پھینکا جا سکتا ہے، ڈی اے وی کالج کی عمارت تھی، جہاں قوم پرستانہ سرگرمیوں کی ہلچل ہر وقت رہتی تھی۔ اسی کالج کے احاطے کی نیچی دیوار پر چڑھنے کے بعد مشہور انقلابی بھگت سنگھ نے برطانوی حکومت کے خلاف پہلا باغیانہ وار کیا تھا۔ لیکن گورنمنٹ کالج کے اندر باہر کی دنیا کی آوازیں تو کیا، ان کی گونج بھی نہیں سنی جا سکتی تھی۔ گورنمنٹ کالج کے کتنے ہی طلبا بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ کیسے ایک طالب علم سر پر گاندھی ٹوپی پہن کر کالج آ گیا تھا اور کیسے چند منٹ کے اندر ہی کالج سے اس کا نام خارج ہو گیا تھا۔ طلبا بڑے جوش اور شوق کے ساتھ ملکِ معظم کے سالِ نو کے پیغام پر، اسپورٹس کی دنیا کے تازہ ترین واقعات پر، گریٹا گاربو، رونالڈ کول مین اور دوسرے اداکاروں کی امریکی فلموں پر بحث کرتے، مگر آزادی کی جد و جہد کے بارے میں کوئی لفظ سرگوشی میں بھی ان کی زبان پر نہ آتا۔ اس ایک پہلو کو چھوڑ، کتنی ہی سرگرمیاں تھیں جو طلبا کو مصروف رکھتی تھیں۔ خوب چہل پہل رہتی تھی۔ آگے بڑھنے اور کارنامے کر دکھانے کا ولولہ جیسے ساری فضا میں رچا ہوا تھا۔ اسپورٹس، تعلیمی زندگی، مقابلے کے امتحانات وغیرہ میں نمایاں کامیابی کا میلان سب کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔

بلراج اس کالج میں 1930 سے 1934 تک رہے۔ یہ چار سالہ وابستگی ان کے لیے کئی پہلوؤں سے نہایت اہم ثابت ہوئی۔ وہ کالج میں اس لیے نہیں داخل ہوئے تھے کہ بعد میں ملازمت کو اپنا کیریر بنائیں۔ کسی خاص پیشے کو اختیار کرنے کے بارے میں انھوں نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ لگے بندھے روزگار یا مستقل یا باقاعدہ کام کی اصطلاحوں میں انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ان کی افتادِ طبع ہی ایسی نہ تھی۔ اور سرکاری ملازمت تو ان کی نظر میں لعنت کی سزاوار تھی، کیونکہ ملک میں ان دنوں کچھ ایسی فضا تھی کہ سرکاری ملازموں کو عوام پر جبر کا وسیلہ سمجھ کر تحقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر پتاجی آسودہ حال نہ ہوتے اور بلراج کے لیے روزی کمانا ضروری ہو جاتا تو ممکن تھا وہ مستقبل کی فکر کرتے۔ لیکن چونکہ معاملہ ایسا نہ تھا، اس لیے ایسی باتوں سے قطعی بے فکر اور بے نیاز تھے۔

پہلی لمبی چھٹیوں میں جب بلراج راولپنڈی آئے تو وہ کالج بلیزر اور سولا ہیٹ پہنے ہوئے تھے۔ اپنے کالج کے بارے میں بہت سی سنسنی خیز کہانیاں سنانے کے لیے ان کے پاس تھیں۔ بڑے جوش و خروش کے ساتھ وہ وہاں کی ایک ایک بات بیان کرتے رہے۔ وہاں وہ ایسی آزادی سے بہرہ ور ہوئے تھے جس کا تجربہ انھیں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ان کے ذہن کے سارے دریچے نئے اثرات کے لیے وا ہو رہے تھے۔ انھوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اپنے انگریزی کے اساتذہ

کا، خاص طور سے ایرک ڈکنسن اور لانگ ہورن کا تذکرہ کیا۔ وہ کالج بوٹ کلب (جس کے وہ ممبر بن چکے تھے) کا، اپنے نئے دوستوں کا، پریم کرپال اور دوسری شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے تھکتے ہی نہیں تھے۔ ایرک ڈکنسن نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی تھی اور ادبی مصروفیتیں اور دلچسپیاں ان کا اوڑھنا بچھونا بنی ہوئی تھیں۔ طلبا سے وہ بے تکلفی سے ملتے تھے۔ لڑکے ان کے گھر آزادی سے آتے جاتے تھے اور پیار میں انھیں 'ڈکی' کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ بلراج دبے دبے جوش کے ساتھ کہتے: "وہ بڑے اسٹائل کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے رہن سہن میں کسی قدر مشرقی شان وشوکت بھی جھلکتی ہے۔ ان کا سات کمروں کا بنگلہ کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہر کمرے میں گوتم بدھ کی مورتی رکھی ہے، جس کے ساتھ روشنی کا ایسا اہتمام ہے کہ بٹن دباتے ہی بدھ کے چہرے پر مہربان مسکراہٹ جگ مگ کرنے لگتی ہے۔ ان کے ڈائننگ روم میں شیڈ والی بجلی کی روشنی ٹھیک اس پھولوں کی تھالی پر پڑتی ہے جو مہاگنی کی گول میز کے بیچ میں رکھی رہتی ہے۔ وہ بہت لاابالی ہیں۔ کوٹ پر چمڑے کے پیوند نظر آتے ہیں۔ منھ میں پائپ دبا رہتا ہے۔ وہ ان نک چڑھے، تندخو برطانوی افسروں سے قطعی مختلف ہیں جو ہمیں راولپنڈی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

لانگ ہورن کا ذکر بھی بلراج بڑے جوش وخروش کے ساتھ کیا کرتے تھے: "پتہ بھی ہے، وہ شیکسپیئر تک پر تنقید کر بیٹھتے ہیں۔ 'ہیملٹ' کا اقتباس سنا کر کہتے ہیں: دیکھو، یہ اسٹریٹ فورڈ آن ایون کا اُجڈ دیہاتی آگے کیا کہتا ہے۔" بلراج سچ مچ ڈکنسن اور لانگ ہورن، دونوں سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور انگریزی ادب کے بڑے جوشیلے طالب علم بن گئے تھے۔

گورنمنٹ کالج میں پہنچ کر بلراج انگریزی میں کہانیاں بھی لکھنے لگے تھے۔ ان میں سے کچھ کالج کے جریدے 'راوی' میں چھپی تھیں۔ ان کی ایک دل کو چھو لینے والی پریم کہانی سری نگر کے راستے میں پڑنے والے ایک گاؤں خیاری میں جنم لیتی ہے۔ چٹانوں کے گرنے کے باعث ایک نوجوان مسافر بھٹک کر اس گاؤں میں جا نکلتا ہے جس ڈھابے والے کے گھر میں اسے اور کئی دوسرے مسافروں کو پناہ ملتی ہے، اس کی کم سن، خوب صورت بیوی سے اسے جذباتی لگاؤ ہو جاتا ہے، مگر محبت کا پھول اس کے دل میں کھلتے ہی مرجھا جاتا ہے، کیونکہ اس درمیان سڑک کی مرمت ہو چکی ہوتی ہے اور کاروں اور بسوں کا کارواں سری نگر کی طرف اپنا سفر پھر شروع کر دیتا ہے۔

ان دنوں بلراج نے چند نظمیں بھی لکھیں، جن میں سے ایک اردو روپ میں اس طرح ہے:

ایک قلم
اور ایک ورق کاغذ کا
سفید چنبیلی جیسا
اور فلک سے دیوتا نازل ہونے لگتے ہیں

ایک اور مرتبہ جب بلراج چھٹیوں میں گھر آئے تو مغربی سنگیت کے بہت سے گراموفون ریکارڈ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان میں بیتھوون کا "مون لائٹ سوناٹا" (چاندنی کا راگ)، کریزلر کا وائلن پر راگ "پیتھے ٹیک" (نغمۂ درد) اور رمسکی۔کورزاکوف کا "شہرزاد" شامل تھے۔ بلراج نے یہ نغمے پہلے ڈکنس کے گھر پر سنے تھے اور ان سے مسحور ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ شیلی کی شاعری کے بارے میں بھی بڑے جوش کے ساتھ اظہارِ رائے کرتے تھے "THE REVOLT OF ISLAM" (اسلام کی بغاوت)، "PROMETHEUS UNBOUND" (پرومیتھیس کی رہائی) اور "ODE TO THE WEST WIND" (ہوائے مغرب سے خطاب) کے اقتباسات وہ لہک لہک کر سناتے تھے۔ وہ مصوری کے شہ پاروں کی نقلیں بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان میں سے ایک تصویر بوٹی سیلی کی بنائی ہوئی تھی۔ 'مونا لیزا' جیسی مشہورِ زمانہ تصویروں اور مائیکل اینجیلو، بونا روٹی اور لیونارڈو ڈا ونچی جیسے باکمال مصوروں کا چرچا ان کی زبان پر اکثر رہتا تھا۔

کالج میں بلراج کی غیر نصابی مصروفیتیں بھی کم نہ تھیں۔ وہ بوٹ کلب کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے، ڈرامیٹک کلب سے وابستہ تھے، یونیورسٹی یونین کے سرگرم عمل ممبر تھے۔ بعد میں اس وقت کے وائس چانسلر اے۔ سی۔ وولنر نے انھیں یونین کا صدر بھی نامزد کیا تھا۔ اس کے علاوہ کہانیاں اور نظمیں بھی لکھ رہے تھے، اگرچہ زیادہ پابندی کے ساتھ نہیں۔

گورنمنٹ کالج میں ہی پہلی بار بلراج صحیح معنوں میں حقیقت نما تھیٹر سے روشناس ہوئے۔ ان دنوں کالج کے ڈرامیٹک کلب کے کرتا دھرتا جی۔ ڈی۔ سوندھی اور احمد شاہ بخاری (پطرس بخاری) تھے۔ جو اسٹیج کے فن کے سورما تھے۔ سوندھی آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے اور ان کے بارے میں یہ چرچا عام تھا کہ انھوں نے آکسفورڈ اسٹیج پر ہیملٹ کا رول ادا کرنے کا نادرِ روزگار امتیاز حاصل کیا تھا۔ بخاری کیمبرج کے پروردہ تھے اور ڈراما پروڈکشن کے فن کو خوب سمجھتے تھے۔ اسی لیے گورنمنٹ کالج اپنے ڈراموں کے لیے بہت مشہور تھا۔ بخاری ڈائرکٹر کے طور پر یکتا تھے تو سوندھی اسٹیج ڈیزائنر کی حیثیت سے بے مثال تھے۔ دونوں مل کر ایک زبردست ٹیم کا درجہ اختیار کر جاتے تھے۔

حقیقت بیانی اور حقیقت نمائی ان کے ڈراموں کی سب سے امتیازی خصوصیت ہوتی تھی۔ اداکار اسٹیج پر فطری بات چیت کے انداز میں بولتے تھے اور اس مبالغہ آمیز پُرتصنع اسلوب سے دور رہتے تھے جس کا چلن پارسی تھیٹر میں تھا۔ اسٹیج سیٹنگ سے بھی حقیقت جھلکتی تھی۔ ڈرامے عموماً مغربی ڈراموں سے ماخوذ اور موضوع کے اعتبار سے رنگا رنگ ہوتے تھے۔ ڈائرکٹر کے طور پر بخاری بہت محنتی، باریک بیں اور کمال پسند تھے۔ اس بات پر وہ ہمیشہ بہت زور دیتے تھے کہ ہر اشارہ، ہر حرکت، گفتگو کے درمیان ہر وقفہ فطری ہو۔ کہیں بھی مبالغہ کا رنگ نہ جھلکے، اسٹیج پر ہونے کا تاثر نہ پیدا ہو۔ خطیبانہ بیان اور مبالغہ آمیز ڈھنگ سے ہاتھ وغیرہ ہلا کر کسی بات کا اظہار قطعی ممنوع تھا۔

بلراج نے اس زمانے بہت زیادہ ڈراموں میں تو اداکاری نہیں کی، لیکن پھر بھی ڈرامیٹک کلب سے عملی وابستگی سے انھیں بعد میں اسٹیج اور فلمی پردے پر، دونوں جگہ بہت فیض پہنچا۔ ڈرامیٹک کلب کی ہر پیش کش میں جزئیات پر پورا دھیان دیا جاتا تھا۔ کہیں بھی کسی بے ڈھنگی یا غیر متوازن کیفیت کے در آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی جاتی تھی۔ ہر ڈراما چُست، رواں دواں، تصنع سے پاک ہوتا تھا، کیونکہ لباس، سیٹ، مناسبتِ وقت وغیرہ پر نہایت باریک بینی کے ساتھ بھرپور توجہ دی جاتی تھی۔ ایک ایک بات کی احتیاط کے ساتھ منصوبہ بندی کی جاتی تھی اور مکمل چوکسی کے ساتھ اسے روبہ عمل لایا جاتا تھا۔ تراجم ہمیشہ بہت اچھّے ہوتے تھے۔ یہ کام اردو کے مشہور ادیب امتیاز علی تاج نے سنبھال رکھّا تھا۔ ان دنوں لڑکیوں کا پارٹ بھی لڑکے ہی کیا کرتے تھے چنانچہ جب "THE MAN WHO ATE THE POPOMACK" اسٹیج کیا گیا تو لیڈی فونٹیلو کے رول کے لیے بلراج کا نام لیا گیا، جو اس وقت ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ بلراج جب تک کالج میں رہے، کئی معرکہ آرا ڈرامے پیش کیے گئے؛ مثلاً کارل کوپیک کا مشہور ناٹک "آر۔یو۔آر۔" ایچ۔سی۔ ہانڈا کا ڈراما "لِلی دا ویاہ" (پنجابی) وغیرہ۔ کالج چھوڑنے کے ایک دو سال بعد بلراج ایک بار پھر گورنمنٹ کالج کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوئے۔ اس مرتبہ "THE BUILDER OF BRIDGES" (پُلوں کا معمار) اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا۔

1933 میں، جب بلراج کالج کے آخری سال میں تھے، میں نے بھی لاہور پہنچ کر اسی کالج میں داخلہ لے لیا۔ پھر لگ بھگ ایک برس تک ہم دونوں ایک ساتھ ہی رہے۔ اس وقت تک گورنمنٹ کالج کے لیے ان کا جوش خروش خاصا ماند پڑ چکا تھا اور وہ روز بروز شک پرستی کی طرف

مائل ہو رہے تھے۔ اب انھیں نہ کالج کے پرشکوہ رسوم و آداب مرعوب کرتے تھے، نہ لیکچر روں کے شاہانہ انداز۔ اس درمیان وہ بوٹنگ میں کالج کا پرچم جیتنے کا اعزاز حاصل کر چکے تھے اور وائس چانسلر نے انھیں یونیورسٹی یونین کا صدر نامزد کر دیا تھا۔ غالباً یہ ان کی بڑھتی ہوئی شک پرستی کا ہی نتیجہ تھا کہ ایک دن طیش میں آ کر انھوں نے بوٹ کلب کے سکریٹری کے عہدے سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ دراصل حسابات میں ایک چھوٹی سی رقم کے بارے میں کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی اور کلب کے اعزازی صدر پروفیسر جارج منتھائی بلراج سے اس سلسلے میں وضاحت طلب کر بیٹھے۔ بس پھر کیا تھا، بلراج کو غصہ آ گیا اور انھوں نے فوراً استعفیٰ دے دیا۔ بعد میں جب پروفیسر منتھائی نے بڑی شفقت کے ساتھ بلراج سے کہا کہ بوٹ کلب سے الگ نہ ہوں اور اپنا عہدہ پھر سنبھال لیں، تو بلراج کی طرف سے انھیں یہ تیکھا، پہیلی جیسا، کسی قدر بچکانہ جواب ملا: "سر، اب میرے پاس بھینٹ چڑھانے کے لیے مزید غیرت باقی نہیں رہی ہے۔"

یونیورسٹی یونین، جس کے بلراج صدر بن گئے تھے، طلبا کی تنظیم تھی، مگر اس کی باگ ڈور یونیورسٹی کے اربابِ اختیار کے ہاتھ میں رہتی تھی اور ان ہی سے اسے مالی امداد بھی ملتی تھی۔ اس کے علاوہ طلبا کی ایک اور تنظیم بھی تھی، جو اسٹوڈینٹس یونین کہلاتی تھی۔ اسٹوڈینٹس یونین عوامی تنظیم تھی اور قومی تحریک سے اس کا قریبی رابطہ رہتا تھا۔ یونیورسٹی یونین ان وسیلوں میں سے ایک تھی جو طلبا کی برادری کو سیاست اور قومی جد و جہد سے الگ تھلگ رکھنے کی خاطر آزمائے جاتے تھے۔ اس کی سرپرستی میں لیکچروں، سیمیناروں اور چھوٹی چھوٹی کانفرنسوں کا اہتمام کیا جاتا تھا جن میں تعلیمی اور ادبی مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ چیدہ طبقے کی ایسی ہی ایک کانفرنس کے اختتامی لمحوں میں بلراج نے اپنی مختصر سی تقریر میں یہ کہہ کر گویا بم کا گولا پھینک دیا:

> اس کانفرنس کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کے لیے میں ایک پنجابی قصے کا سہارا لینا چاہتا ہوں، جو اس طرح ہے: ایک شخص دوسرے شخص سے کہتا ہے "میرے مکان کی سب سے اوپر کی منزل پر ایک کمرہ ہے۔ اس کمرے کے اوپر ایک اٹاری ہے۔ اس اٹاری میں ایک صندوق ہے۔ اس صندوق میں ایک تھیلا ہے۔ اس تھیلے میں ایک بٹوا ہے۔ اس بٹوے میں ایک کھوٹا پیسہ ہے۔ میں وہ کھوٹا پیسہ نکال کر لاؤں گا اور آپ کی تواضع مٹھائی سے کروں گا۔

یہ قصہ سنا کر بلراج بیٹھ گئے۔

ایک اور موقع پر (شاید ڈنر پارٹی تھی، جس میں یونیورسٹی کے بہت سے بڑے بڑے لوگوں نے شرکت کی تھی) بلراج نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

ہمارے ملک میں جو تعلیمی نظام رائج ہے وہ کسی پُر تکلف ڈنر پارٹی کی طرح ہے۔ مہمان اپنی بہترین ڈنر جیکٹ پہن کر آئے ہیں۔ ڈنر ٹیبل چاندی کے چمچوں کانٹوں، چھریوں اور انتہائی قیمتی چینی کے ظروف سے جگمگا رہی ہے۔ دل کش وردی میں ملبوس بیروں کی پوری فوج موجود ہے۔ مگر افسوس، کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے!

اس طرح کے کلمات سے جمے جمائے نظام کے خلاف ایک قسم کا احتجاج جھلکتا تھا، دوسرے طلبا کے مانند چاروناچار نظامِ وقت کا ساتھ دینے سے ایک قسم کا پُرزور انکار نمایاں ہوتا تھا۔ ذہنی طور پر ایک ایسے ادارے سے خود کو ہم آہنگ کرنا انھیں اب دشوار معلوم ہو رہا تھا جو برطانوی مفادات کو بڑھاوا دینے کا کام کر رہا تھا۔ اسی لیے یہ احتجاجی اشارے بار بار ان کی زبان سے نکل پڑتے تھے۔

ان دنوں لاہور میں بلراج کو جس نے بھی دیکھا ہوگا، انھیں بلراج کا حلیہ ضرور یاد ہوگا۔ ایک پُرانی سی سائیکل پر سوار۔ ذرا انوکھے ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہوئے۔ سر پر پٹو کی گول باڑھ کی ٹوپی۔ اس کے ساتھ کالج بلیزر اور اس کے نیچے اسکاٹش انداز کی نیکر، یہ غیر روایتی لباس ان کی اور ان کے کالج کے دوست چیتن آنند کی ایجاد تھا۔ یہ کوشش بھی کی گئی تھی کہ دوسرے طلبا بھی اسے اپنائیں۔ گورنمنٹ کالج کی روایتی ضابطہ پرستیوں اور معمولات کی خلاف ورزی کا انھیں یہی ڈھنگ سوجھا تھا۔

گورنمنٹ کالج کے بارے میں بلراج اکثر تند و تیز اور کڑوے کسیلے فقرے چُست کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ دیوالی کے موقع پر وہ اور میں انار کلی سے گزر رہے تھے۔ معمول کے مطابق بھیڑ بھاڑ بہت تھی۔ ایک طالب علم نے ایک راہ گیر لڑکی سے بدتمیزی کی تو بلراج نے فوراً مجھ سے کہا:

"یہ لڑکا ضرور لا کالج کا طالب علم ہوگا۔ لا کالج کے طلبا ایسی حرکتوں کے لیے بدنام بھی بہت ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ گورنمنٹ کالج کے طلبا ان سے کچھ بہتر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا سلیقے سے بدتمیزی کرتے ہیں۔"

ایک اور موقع پر، اخبار میں ہندوستانی ہاکی ٹیم کا فوٹو دیکھ کر بلراج کہنے لگے: "گورنمنٹ کالج کے کھلاڑی کو فوراً پہچانا جاسکتا ہے ۔ فوٹو کھینچا جارہا ہو تو وہ سب سے آگے، کیمرے کے ٹھیک سامنے ہوگا۔ گورنمنٹ کالج کا طالب علم باقی دس کھلاڑیوں کو بڑے اطمینان سے ایک طرف دھکیل دے گا، تاکہ خود سب سے آگے کھڑا ہو سکے۔"

وہ اکثر کہا کرتے تھے: "یہ کالج صوبہ بھر کے طلباء کے بہترین جوہر کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور انھیں افسر شاہی چھیمن میں بدل کر رکھ دیتا ہے۔" ہمارے ایک رشتے کے بھائی اسی کالج کے ایک سینیر طالب علم تھے۔ بلراج نے بڑے اہانت آمیز لہجے میں ایک روزان کا ذکر کیا، کیونکہ انھوں نے اپنے مقالے میں 'کانگریسی' کی جگہ 'کانگریس والے' کی اصطلاح استعمال کی تھی۔

سول سروس میں شامل ہونے کے سوال نے بلراج کے ذہن میں کبھی سر نہیں اٹھایا۔ اس کا ایک سبب تو ان کا خاندانی پس منظر اور اوائل عمر میں پڑنے والے اثرات تھے، لیکن زیادہ بڑا سبب یہ تھا کہ ان دنوں بیوروکریسی کو ہمارے ملک میں جبر کا آلۂ کار سمجھا جاتا تھا اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

جب "THE MAN WHO ATE THE POPOMACK" اسٹیج کیا جارہا تھا تو ایک واقعہ ایسا ہوا جو بذاتِ خود تو زیادہ اہم نہیں، مگر بلراج کی بے باک اور غیر رسم پرست مزاج کی نشان دہی ضرور کرتا ہے۔ ہوا یہ کہ گورنمنٹ کالج میں ڈرامے عموماً رات کے کھانے کے بعد نو بجے شروع ہوتے تھے۔ شو کے بعد ساری کاسٹ کشادہ اسٹاف روم میں جمع ہو جاتی تھی، جہاں ہلکی پھلکی غذا پر مشتمل سپر (آخری کھانا) سجا رہتا تھا۔ اس کھانے میں کاسٹ میں شامل طلباء کو چائے اور ڈبل روٹی کے خشک سلائس دیے جاتے تھے، مگر اساتذہ وغیرہ سینڈوچ، شامی کباب اور پڈنگ مزے لے لے کر کھاتے نظر آتے تھے۔ اگر استادوں کے کھانے کا اہتمام کسی الگ کمرے میں کیا جاتا تو شاید کسی کو نہ کھلتا، مگر آفت یہ تھی کہ وہ سینڈوچ اور پڈنگ پر اسی میز پر ہاتھ صاف کرتے تھے جہاں بے چارے طلباء سوکھے سلائس کو چبانے کی مشقت میں مبتلا ہوتے تھے۔ ایک رات کو ذرا گڑبڑ ہو گئی۔ جب ڈراما ختم ہوا اور کاسٹ سپر کے لیے جمع ہوئی تو پتہ چلا کہ استادوں کے ناشتہ دان بالکل خالی پڑے ہیں۔ جب ڈراما چل رہا تھا تو کچھ دل جلے ان کا سپر پہلے ہی چٹ کر گئے تھے۔ بلراج ان میں شامل تھے یا نہیں، یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، مگر یہ امر یقینی تھا کہ بلراج بے انتہا خوش تھے۔ خوشی انھیں اس بات کی تھی کہ مغرور اور خود پسند استادوں

کو کسی نے سبق تو سکھایا۔ استادوں نے اس واقعہ کے باب میں اپنے ہونٹ سیے رکھے۔ جب کسی نے کہا کہ لیکچررز تو اپنا ٹفن اپنے اپنے گھر سے لے کر آئے تھے تو بلراج نے فوراً پلٹ کر جواب دیا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ جب ہم سوکھے توس چبا رہے ہوں تو انھیں کباب کھانے کا کیا حق ہے ؟ "، اس طرح کی چھیڑ چھاڑ کرنا واقعی بہت ہمّت کا کام تھا ، خاص طور سے ان دنوں، جب گورنمنٹ کالج کے لیکچررز اپنے آپ کو سرکار کے آئی سی ایس افسروں سے کسی طور کم نہیں سمجھتے تھے اور ان کا رویّہ ویسا ہی حاکمانہ ہوتا تھا۔

بعد کے برسوں میں اسپورٹس میں بلراج کی دلچسپی زیادہ نہیں رہی تھی، لیکن کالج کے سوئمنگ پول میں تیرنا، لمبی چہل قدمی، سیر سپاٹا اور مٹر گشت پھر بھی ان کے مرغوب مشغلے رہے۔ اکثر اوقات ان کی نقل و حرکت تعلیمی حصار کے اندر ہی محدود رہتی تھی۔ کالج اور یونیورسٹی کی لائبریریاں، ایرک ڈکنس کا بنگلہ، سوئمنگ پول، یونیورسٹی یونین، کبھی کبھار 'اسٹفلز' یا 'لورانگس' (یہ دونوں ریستوراں مال پر واقع تھے) ــــ یہی ان کے آنے جانے کے ٹھکانے تھے۔ طلبا کے خاص اڈے کے طور پر کافی ہاؤس اس وقت تک عالم وجود میں نہیں آیا تھا۔ یہ کئی برس بعد کھلا۔ بلراج مطالعہ کے بہت شوقین تھے، لیکن ان کا مطالعہ تنظیم اور منصوبہ بندی کا پابند نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نظم و ترتیب کا عنصر ان کی کسی بھی سرگرمی میں نہ تھا۔ جب وہ ایم اے (انگلش) کا امتحان دے رہے تھے تو ایک دن انھیں یکایک یہ نکتہ سوجھا کہ انھیں ایچ۔ جی۔ ویلز کے صرف ان دو ناولوں پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے جو ان کے کورس میں شامل تھے ، بلکہ اس مصنّف کے دوسرے ناول بھی پڑھ ڈالنے چاہئیں۔ امتحان کی تیاری کرنے کے لیے صرف چند روز باقی بچے تھے، مگر بلراج نے اس وقت کو درسی کتابوں کی نذر کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایچ۔ جی۔ ویلز کے ناول پڑھ پڑھ کر لطف اندوز ہوتے رہے۔ جب امتحان شروع ہوا تو نشاطِ مطالعہ کے اس دور میں ناگوار خلل پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا پرچہ خراب ہو گیا اور بہت کم نمبر انھیں ملے۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب بلراج کالج کے آخری سال میں تھے کہ ایک روز جوش میں بھرے، بہت شاداں و فرحاں وہ گھر آئے۔ اس وقت 16 ، کوپر روڈ پر ہمارا قیام تھا، جہاں ہم نے ایک دوست کے گھر میں دو کمرے کرائے پر لے رکھے تھے۔ بلراج مال کے بلیک مہنگے ہیئر کٹنگ سیلون میں بال کٹوانے گئے تھے۔ جوش کے عالم میں گھر واپس آتے ہی

انھوں نے کالج میگزین اُٹھایا، دوبارہ سائیکل پر سوار ہوئے اور یہ جا وہ جا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ پھر واپس آئے تو پہلے ہی کی طرح جوش میں آئے۔

میں نے پوچھا "کیا معاملہ ہے ؟" ان کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ کہنے لگے "ہیئر ڈریسر کے یہاں میرے بال ایک اینگلو انڈین لڑکی نے تراشے ہیں۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں کہانیاں بھی لکھتا ہوں تو اس نے میری کہانیاں پڑھنے کے لیے بہت اشتیاق ظاہر کیا۔ اسی لیے میں اسے کالج میگزین دے کر آ رہا ہوں۔ اسے ادب سے گہرا لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ بہت شائستہ اور مہذب لڑکی ہے، مجھے اس نے بہت متاثر کیا ہے۔"

اس "پری جمال، شائستہ ہیئر ڈریسر" نے بلراج کی کتنی کہانیاں پڑھیں، یہ راز مجھے معلوم نہیں ہوسکا۔ لیکن یہ سرسری شناسائی لاحاصل ہی رہی ہوگی، کیونکہ بلراج نے اس روز کے بعد اُس شوخ ادا کا ذکر کبھی نہیں کیا۔

اس زمانے میں بلراج نے کافی دوستیاں بھی کیں، گہری وابستگی بھی پروان چڑھائی۔ خاص طور سے کشمیر میں، جہاں ہمارا خاندان گرمیوں میں رہا کرتا تھا۔ ان کی صورت اچھی اور وجیہہ تھی۔ خلوص اور خوش دلی مزاج میں رچی ہوئی تھی۔ طبیعت گھُل مِل جانے والی پائی تھی۔ گفت گو کے فن میں ماہر تھے۔ مزاح اور زندگی کا ولولہ ان کے وجود میں گویا بپھرتا پھرتا تھا۔ اس لیے لوگ ان کے ساتھ مل بیٹھنے کے اکثر خواہاں رہتے تھے۔ ایک نوجوان لڑکی جو ہماری ایک رشتے کی بہن کی سہیلی تھی، بلراج کی پرستاری میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گئی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے یہ خواب دیکھا کہ بلراج امریکہ کے صدر بن گئے ہیں اور اس سے ملاقات کرنے کے لیے ایک شان دار، بہت چوڑے زینے سے نیچے اُتر رہے ہیں! ایک اور موقع پر ایک جوان خاتون، جن کا تعلق ہمارے خاندان کے حلقے سے ہی تھا، کسی بات پر بلراج سے خفا ہو گئیں اور انھیں کڑوی کسیلی سنانے لگیں: "اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ تم بہت خوب رو ہو۔ تم سے کہیں زیادہ خوب رو تو تمھارے پتا جی ہی ہیں!"

بلراج کی اس دور کی ایک اور دوستی سنتوش سے رہی، جو ہماری رشتے کی بہن تھیں اور بلراج سے لگ بھگ پانچ برس چھوٹی تھیں۔ بلراج کی بعد کی زندگی میں اس دوستی کو بہت قوی اور قریبی، بہت اہم اور فیصلہ کن ثابت ہونا تھا۔ ان دنوں نوجوانوں کی مجلسی زندگی بڑی حد تک خاندانی حلقے تک ہی محدود رہتی تھی۔ دوستی اور لگاؤ کے رشتے اسی دائرے کے اندر پنپتے تھے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کو کھلے عام، بے روک ٹوک ملنے کی وہ آزادی حاصل نہ تھی جس نے بعد میں بڑے

شہروں اور یونیورسٹیوں میں اپنا جلوہ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ یہ دوستیاں، اخلاق اور شائستگی، کے تابع رہتی تھیں اس لیے کہ روایت اور رواج ان کی نگہبانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

بلراج نے آزاد، سہاروں سے بے نیاز، کسی قدر سرکش اور اپنی راہ آپ بنانے والی طبیعت پائی تھی۔ وہ ایسے کام اکثر کر بیٹھتے تھے جو عام روش سے ہٹ کر ہوتے۔ لیکن یہ سوچنا غلط ہوگا کہ ان کی دل چسپیوں اور میلانات نے کوئی خاص مقررہ رُخ اختیار کر لیا تھا، یا پختگی کو پہنچ کر قوی جذبۂ عمل بن گئے تھے، یا کسی ایسے بے پناہ شوق میں بدل گئے تھے جس میں وہ ہر آن پوری طرح کھوئے رہیں۔ کبھی کبھی وہ زبردست قوتِ ارادی کا مظاہرہ کر بیٹھتے تھے جو ضد اور اڑیل پن کی حدوں کو چھوتی نظر آتی تھی۔ گورنمنٹ کالج کے ایک عام طالب علم کے مقابلے میں بہرحال ان کا سماجی شعور زیادہ گہرا تھا۔ وہ زیادہ حساس، زیادہ بے باک تھے۔ گورنمنٹ کالج کے احاطے کے باہر جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا ردِّعمل ان پر زیادہ تیزی سے، زیادہ شدید ہوتا تھا۔

ان دنوں ہمارا خاندان گرمیوں کا موسم سری نگر میں گزارا کرتا تھا۔ پتا جی نے وہاں اپنی سوَرگ باسی بہن کے گھر کے قریب ہی مکان بنوا لیا تھا۔ بواجی کے گھر میں ان کا لمبا چوڑا کنبہ آباد تھا۔ ایک دن ہم سب مغلوں کے دور کے ایک باغ میں پکنک منانے گئے۔ وہاں یکایک بلراج کے سر میں یہ سودا سمایا کہ چھلانگ لگا کر ایک نالے کو پار کیا جائے۔ نالہ کافی چوڑا تھا اور اس کے دونوں کناروں پر پتھر کا کھرنجا تھا۔ اس کھیل میں دوسرے لڑکے بھی شریک ہو گئے۔ مگر یہ خاصا پُرخطر کھیل تھا۔ اگر کوئی لڑکا چھلانگ لگا کر نالے کو پار کرنے میں ناکام رہتا تو اس کے قدم نالے کے پانی میں پڑتے، اور ایسی صورت میں پتھریلی تہ کے ناہموار ہونے کی وجہ سے پاؤں میں موچ آ جانے یا ہڈی ٹوٹ جانے کا کافی امکان تھا۔ بلراج نے ایک بار، دو بار، تین بار طبع آزمائی کی، مگر نالے کو پار کرنے میں کام یاب نہ ہو سکے۔ ہر مرتبہ وہ دور سے دوڑتے ہوئے آتے اور بساط بھر لمبی جست لگا دیتے، مگر ان کے قدم ٹھیک پانی میں جا پڑتے۔ کام یابی دوسرے لڑکوں کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مگر وہ جلد ہی تھک ہار کر میدان چھوڑ گئے۔ ایک بلراج تھے جو ہار ماننے کو تیار نہ تھے۔ وہ مسلسل کوشش کرتے رہے۔ بیچ بیچ میں وہ تھوڑا سا آرام کرنے کے لیے بیٹھ بھی جاتے تھے اور اس کے بعد ایک نئے جوش کے ساتھ اپنی مہم شروع کر دیتے تھے۔ پتہ نہیں کتنی کوششوں کے بعد وہ انجام کار نالے کے پار چھلانگ لگانے میں کام یاب

ہو ہی گئے۔ پھر وہ اپنے کارنامے پر نازاں باقی لوگوں سے آملے۔ ان کا چہرہ کامرانی اور خوشی کے احساس سے دمک رہا تھا۔

مجھے ایک اور واقعہ بھی یاد آرہا ہے جو اس سے بھی زیادہ پُرخطر تھا اور سری نگر میں ہی پیش آیا تھا۔ سری نگر کے نمائش کے میدان میں لکڑی کا ایک بہت اونچا پھسلواں تختہ تھا۔ بلراج نے یکایک یہ فیصلہ کر ڈالا کہ وہ اس تختے پر کھڑے کھڑے پھسل کر نیچے آکر دکھائیں گے۔ تختے کی سطح بہت چکنی تھی۔ جو لوگ اس پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے پھسلتے تھے، وہ بھی اکثر اپنا توازن کھو بیٹھتے تھے اور لڑھکتے ہوئے نیچے آگرتے تھے۔ کھڑے کھڑے اس پر سے اُترنے کی کوشش کرنا جان بوجھ کر آفت کو دعوت دینا تھا۔ توازن قائم نہ رہنے کی صورت میں آدمی سر کے بل گر سکتا تھا اور اپنے جسم کی کئی ہڈیوں کو توڑ پھوڑ سکتا تھا۔ یہ بھی امکان تھا کہ وہ نیچے سے جنگلے کے اوپر سے لڑھک کر ایک طرف کو زمین پر جا گرتے اور اپنے آپ کو بُری طرح زخمی کر بیٹھتے۔ لیکن بلراج کو کون روک سکتا تھا؟ انھوں نے دو بار کوشش کی اور بڑی طرح نیچے گرے۔ ان کی پینٹ گھٹنوں پر سے پھٹ گئی اور جسم پر کئی جگہ چوٹیں اور خراشیں آئیں مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری اور برابر کوشش کرتے رہے۔ دوست انھیں دیکھ کر پریشان اور سراسیمہ ہوتے رہے، مگر وہ اس وقت تک اپنا کرتب دکھانے سے باز نہ آئے جب تک انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کا صحیح انداز دریافت نہ کر لیا۔ پھر وہ سیدھے کھڑے۔ ہاتھ پھیلائے بڑے شان دار انداز سے۔ توازن کا پورا کمال دکھاتے ہوئے پھسل کر نیچے آگئے۔

سری نگر میں پتاجی نے جو مکان بنوایا تھا، اس میں بلراج نے کئی نظر فریب ندرتوں کا اضافہ کیا تھا۔ گھر کی بیرونی دیوار میں اونچا سا محراب دار پھاٹک ان ہی کے ڈیزائن کے مطابق بنایا گیا تھا جس سے یہ گمان گزرتا تھا کہ آدمی کسی گرجا کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ ہشت پہلو ڈائننگ ٹیبل، کپڑے ٹانگنے کے لیے اوپر کو مڑی ہوئی کھونٹیاں، برآمدے کے لیے نیچی آرام کرسیاں وغیرہ ان ہی کے تجویز کیے ہوئے ڈیزائنوں کے مطابق تیار کرائی گئی تھیں، اور ان کے نہایت طبع زاد اور جاذبِ توجہ ہونے میں بہرحال کوئی شبہ نہ تھا۔

کشمیر اس زمانے میں برطانوی ہند سے الگ ایک ریاست تھا۔ وہاں مہاراجہ کی حکومت تھی۔ بہت سے انگریزوں کے لیے کشمیر کو چھٹیاں منانے کے لیے تفریح گاہ کا درجہ بھی حاصل تھا۔ گل مرگ۔ سونامرگ وغیرہ میں یورپین بڑی تعداد میں چھٹیاں منانے کے لیے آتے

تھے۔ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوان وہاں کی صورتِ حال کو ایک انوکھے ہی رنگ میں دیکھتے تھے۔ کشمیر کا مہاراجہ ہری سنگھ ان کی نظر میں ایک باغی راجہ تھا۔ ان کی ساری ہمدردی مہاراجہ کے ساتھ تھی۔ برطانویوں کی موجودگی کو وہ بے جا دخل اندازی اور غاصبانہ قبضے کا ہم پلہ سمجھتے تھے۔ مہاراجہ نے تخت نشین ہوتے ہی کچھ آزادانہ اقدام کیے تھے، جس کی وجہ سے نوجوان نسل اس کی پرستار بن گئی تھی۔ مشہور تھا کہ اس نے برطانوی ریزیڈینٹ کی کھلی مخالفت کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ کشمیر میں صرف ایک جھنڈا لہرائے گا، اور وہ مہاراجہ کا جھنڈا ہو گا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اپنے لیے اس نے 21 توپوں کی سلامی مقرر کی ہے، جب کہ یہ سلامی صرف برطانوی شہنشاہ کے لیے مخصوص تھی۔ مہاراجہ کی ان جسارتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سُبکی ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور اسے بتا دیا گیا کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے۔ لیکن یہ نقش اس نے ضرور ذہنوں پر جما دیا کہ اپنے حقوق کے لیے آواز اُٹھانے اور لڑنے کی ہمت اس میں واقعی ہے۔ نوجوانوں نے اسے اس حد تک اپنا ہیرو بنا رکھا تھا کہ اس کے بارے میں جو الٹی سیدھی کہانیاں مشہور تھیں ان کو وہ برطانویوں کی کارستانی سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مہاراجہ کو بلیک میل کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ کہانیاں پھیلائی ہیں۔ اسی لیے برطانوی سیاحوں اور چھٹیاں منانے والوں کے لیے ان کے دلوں میں بغض اور دشمنی کا جذبہ رچا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ گل مرگ میں بلراج گھوڑے پر سوار اس راستے پر جا رہے تھے جو گھوڑوں کے چلنے کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ دوسری طرف سے ایک انگریز آ رہا تھا۔ بلراج کے قریب سے جب وہ گزرا تو کہنے لگا "آپ گھوڑے کو چابک سے اتنی بُری طرح کیوں مارتے ہیں؟" بلراج نے اپنے گھوڑے کو روک کر ترکی بہ ترکی جواب دیا "میں نے انگریزوں کو اس سے بھی بُری طرح چابک سے انسانوں کی پٹائی کرتے دیکھا ہے۔ گھوڑے کے لیے آپ کی ہمدردی کسی قدر بے جا اور بے محل معلوم ہوتی ہے۔"

ان ہی دنوں کشمیر میں مہاراجہ کی حکومت کے خلاف بڑے پیمانے پر عوامی شورش شروع ہوئی۔ اس شورش کے مقاصد زیادہ واضح نہ تھے۔ متوسط طبقے کے نوجوان الجھن اور گومگو کے عالم میں تھے۔ عوام کی جدوجہد سے انھیں ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ کبھی کبھی ان کشمیریوں کو وہ دل کھول کر مذاق کا نشانہ بناتے تھے جن میں لاٹھی چارج ہونے پر بھگدڑ مچ جاتی تھی اور جو میدان میں اپنے پیچھے چپلوں اور "لوٹیوں" (گرم چادروں) کے انبار چھوڑ جاتے تھے۔ ان نوجوانوں کے دلوں میں برطانویوں کے خلاف تو نفرت کا جذبہ ضرور تھا، مگر جدوجہد کرنے والے

کشمیریوں سے انھیں کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اسی لیے ایک روز جب بلراج اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو یہ کہہ کر انھوں نے سب دوستوں کو چونکا ہی نہیں بلکہ حیران بھی کر دیا :

آخر اس ریاست میں ساری تجوریوں کی چابیاں صرف مہاراجہ یا پنجابی بیوپاریوں کے ہاتھ میں کیوں ہیں، جب کہ یہ لوگ یہاں کے ہیں بھی نہیں مگر پوری سنگ دلی کے ساتھ مقامی باشندوں کو لوٹنے کھسوٹنے میں مصروف ہیں۔

بہت سے کانوں کے لیے بلراج کا بیان کیا ہوا یہ نکتہ پریشان کن شور بن کر گونجتا رہا۔ کشمیر سے بلراج کا لگاؤ 1930 کی دہائی میں شروع ہوا تھا۔ بعد میں اس لگاؤ کو اور بھی گہرا، اور بھی قریبی ہونا تھا۔ کشمیر ایک اعتبار سے ان کا دوسرا وطن ہو گیا تھا۔ وہاں کی دل کش مناظر سے مالا مال فضا، لمبی سیر، جھیلوں میں دیر تک تیراکی وغیرہ ان کی روح تک کو سرشار کر جاتے تھے۔ کشمیر ان کے لیے گہری وابستگی کا مرکز بن گیا تھا۔ انھوں نے اپنی بہت سی چھوٹی چھوٹی مسحور کن نظمیں اور کہانیاں یہیں لکھیں۔ آنے والے برسوں میں یہ ان کی تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کا میدان بھی بنا۔

3

لاہور سے واپسی

انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد اپریل 1934 میں بلراج راولپنڈی واپس آ گئے اور کاروبار میں پتاجی کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ان کے مزاج کے پیشِ نظر ان کا کاروبار کے بکھیڑے میں پڑ جانا ذرا عجیب ہی تھا، کیونکہ ان کے شوق اور دلچسپیاں اس میدان سے بالکل الگ تھے۔ کاروباری لائن اختیار کرنے کا فیصلہ دراصل ان کے لیے فیصلہ کم اور فیصلے سے دامن بچانے کا حیلہ زیادہ تھا۔ اصلیت یہ تھی کہ ان دنوں بزنس کا کوئی بدل اگر ممکن تھا وہ سرکاری ملازمت تھی، اور اسے بلراج اور پتاجی دونوں ہی یک سر مسترد کر چکے تھے۔ لکھنا لکھانا اس زمانے میں کیریر نہیں تصوّر کیا جا سکتا تھا اور میرا خیال ہے خود بلراج نے لکھنے لکھانے کو کل وقتی پیشے کے طور پر اپنانے کے بارے میں شاید ہی کبھی سوچا ہو۔ بلراج جیسی طبیعت کے شخص کے لیے غالباً لکھنا لکھانا اور کاروبار، شوق اور ذریعۂ معاش کا مناسب ترین جوڑ تھا۔

پتاجی کا بزنس بہت سہل سا معاملہ تھا۔ انھوں نے انگلستان اور فرانس کی کچھ فرموں کی سول ایجنسی لے رکھی تھی، جن کے لیے وہ مارکیٹ سے آرڈر حاصل کرتے تھے۔ اس کام کے عوض انھیں معقول کمیشن ملتا تھا۔ وقت کے ساتھ ان کے گاہک بھی لگے بندھے ہو گئے تھے اور اشیائے تجارت بھی محدود ہو گئی تھیں۔ بس تھوڑے سے چلتے ہوئے برانڈ تھے، جن کے لیے آرڈر انھیں زیادہ دوڑ دھوپ کے بغیر ہی مل جاتے تھے۔ اکثر ڈیلر خود ہی آرڈر بھیج دیتے تھے اور پتاجی ان آرڈروں کو متعلقہ صنعتی اداروں اور مال سپلائی کرنے والی فرموں کو ارسال کر دیتے تھے۔ اس طرح پتاجی کے آرڈر کے کاروبار میں جوکھم کا عنصر تھا ہی نہیں۔ سرمایہ بھی یا تو سرے سے درکار نہ ہوتا یا بہت کم درکار ہوتا۔ پتاجی جب کاروبار کو بڑھانے کی بات سوچتے تھے تو ان کے ذہن میں صرف یہ ہوتا تھا کہ کچھ نئی اشیائے تجارت (مثال کے طور پر کپڑے کے تھان وغیرہ) اس آرڈر کے بزنس میں مزید شامل کر لیے جائیں۔ جب بلراج پتاجی کا ہاتھ بٹانے لگے تو پتاجی نے کپڑے کی

ملوں سے اپنے پرانے تعلقات نئے سرے سے استوار کیے اور کچھ نئی ایجنسیاں بھی لے لیں۔ بلراج کے لیے اس قسم کا آرڈر کا بزنس کرنا بلاشبہ آسان تھا۔ اس میں مالی جوکھم بھی نہ تھا اور انھیں اپنی دوسری مشغولیتوں کے لیے کافی وقت بھی مل جاتا تھا۔

بلراج نے تجارت بھی کی تو اسی بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ جوان کے مزاج کا حصہ تھی۔ اپنی کالج کی تعلیم، آزادروی، سہولت پسندی اور ادبی میلانات کے باعث وہ اگر چاہتے بھی تو مثالی قسم کے کمیشن ایجنٹ نہیں بن سکتے تھے۔ اچھا کمیشن ایجنٹ بننا خاصا صبر آزما کام ہے۔ اس کے لیے دکان داروں سے اچھے تعلقات کی بنا ڈالنا پڑتی ہے، ان کی ترنگیں اور نخرے سہنے پڑتے ہیں، آرڈر حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی ترغیبیں دینا پڑتی ہیں۔ ہمارے بازاروں میں کمیشن ایجنٹ کو ــــ خاص طور سے آرڈر کا بزنس کرنے والے کمیشن ایجنٹ کو ڈیلر وبال جان سمجھتے ہیں اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر کمیشن ایجنٹ کسی مشہور، سکہ بند شے کا آرڈر حاصل کرنے آیا ہے تو اس کا استقبال خوش دلی سے کیا جاتا ہے، لیکن اگر وہ کوئی نئی شے بیچنے کی فکر میں ہے تو اسے گھنٹوں انتظار کرایا جاتا ہے اور اس کے بعد بھی دکان دار بڑے سرپرستانہ انداز میں اس کے لائے ہوئے سیمپل ملاحظہ کرتا ہے۔ اسی لیے ایک کامیاب کمیشن ایجنٹ کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ بہت مستقل مزاج ہو اور بہت موٹی کھال کا ہو، اور بے چارے بلراج ان 'خوبیوں' سے بالکل محروم تھے۔ ضرورت مند کمیشن ایجنٹ گاہکوں کو رجھاتا اور پرچاتا پھرتا ہے، کیلنڈر اور مفت تحفے ان کی نذر کرتا ہے، ہر قسم کی ذلتیں سہتا ہے۔ مگر بلراج ایسے ضرورت مند نہ تھے۔ پھر بھی اس دھندے کو انھوں نے پوری بشاشت کے ساتھ اپنایا اور اپنے معمول کے زندہ دلانہ، غیر روایتی انداز سے اسے فروغ دینے کی کوشش کی۔ بازار میں کرائے پر ایک فلیٹ لیا گیا اور وہاں باضابطہ دفتر قائم کیا گیا۔ اپنی افتادِ طبع کے مطابق، دفتر کے فرنیچر کا ڈیزائن انھوں نے خود ہی تیار کیا۔ میز نیم دائرہ نما تھی، جس میں متعدد درازیں تھیں۔ سیمپلوں کو رکھنے کے لیے اونچی اونچی، چھت کو چھوتی ہوئی الماریاں بنوائی گئی تھیں۔ ایک دلال اور ایک چپراسی کا تقرر بھی کیا گیا۔

مجھے یاد ہے، ایک موقع پر بلراج لٹھے کی ایک نئی قسم کو بازار میں معروف بنانے کی مہم میں مصروف ہوئے۔ مگر جس انداز سے یہ مہم چلائی گئی، اس سے ان کی سادہ لوحی صاف جھلکتی تھی۔ بازار میں متعارف کرانے کی غرض سے اس کپڑے کا ایک چھوٹا سا پارسل موصول ہوا تھا۔ ایسی صورت میں عام دستور یہ تھا کہ نئی قسم کے کپڑے کے کچھ ٹکڑے خاص خاص تھوک اور پرچون ڈیلروں کے حوالے

کر دیے جاتے تھے اور اس طرح خریداروں کے ردِ عمل کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ لیکن بلراج نے اپنی الگ راہ اختیار کی۔ انھوں نے پہلے برانڈ کے نام کو مقبول بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے کچھ پرانے، کالج کے زمانے کے دوستوں کو بازار میں بھیجا۔ یہ دوست ان کے منصوبے کے مطابق مختلف دکانوں پر 'ہیرک مارکہ لٹّھا' طلب کرتے پھرے۔ بلراج کا خیال تھا کہ اس برانڈ کے لیے گاہکوں کی مانگ سے متاثر ہو کر دکان دار اس کے لیے بڑے بڑے آرڈر دینے پر خود ہی آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن بلراج کی توقع کے برعکس یہ منصوبہ جلد ہی ٹھپ ہو گیا۔ ایک دکان دار، جو خود بھی کبھی بلراج کا ہم جماعت رہ چکا تھا، 'گاہکوں' کے جانے پہچانے چہروں کو تاڑ گیا۔ اس نے ایک 'گاہک' سے کہا: "ذرا بلراج کو میرے پاس بھیج دینا۔ میں اسے سکھاؤں گا کہ لٹھے کی فروخت کس طرح بڑھائی جا سکتی ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر بلراج کاروبار زیادہ سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ کرتے تو بھی شاید وہ زیادہ آگے نہ بڑھتے۔ بڑے بڑے کاروباری مرکزوں میں بڑے پیمانے کی تجارت کرنے کے سپنے دیکھنا پتا جی کے لیے جتنا سہل تھا، ایسی تجارت کے میدان میں بے دھڑک کود جانا ان کے لیے اتنا ہی دشوار تھا۔ انھوں نے زندگی میں جو کچھ کمایا تھا، پیسہ پیسہ کر کے کمایا تھا، سخت محنت کر کے کمایا تھا، چھوٹے چھوٹے آرڈروں اور قلیل کمیشنوں پر قناعت کر کے کمایا تھا۔ اگر انھوں نے سٹّے کے ذریعہ دولت کمائی ہوتی تو ان میں کم از کم ایسی تاجرانہ ذہنیت تو پیدا ہو ہی جاتی ہے جو سٹّہ لگانے والوں کی طرح بڑے سے بڑے جوکھم کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ پھر پتا جی کو دولت کی ہوس بھی کبھی نہیں رہی، اور جو تاجر ہونے کا مدّعی ہو، اس کے لیے یہ بلاشبہ ایک بڑی کوتاہی ہے۔ ایسا شخص اونچی اونچی بازیوں کا جوا کیسے کھیل سکتا ہے جو 'بھکتی رس' کے اشعار سناتا رہے، مال و زر سے لالچ کی مذمت کرتا رہے، دان پُن اور سماج سیوا کے قصیدے پڑھتا رہے، بچوں کو سادگی سے رہنے اور اونچے خیـ ـ ت کی تلقین کرتا رہے؟ پتا جی کے ان ہی میلانات نے یہ رنگ دکھایا تھا کہ بلراج جب لاہور سے واپس آئے تو روزگار کی حد تک پتا جی نیم سبکدوشی کی زندگی گزار رہے تھے اور ان کا زیادہ وقت آریہ سماج کی تبلیغی سرگرمیوں کی نذر ہوتا تھا۔ اب بلراج نے کام کا بار سنبھالا تو پتا جی اس بات کے زیادہ حق میں نہ تھے کہ بہت سا سرمایہ لگا کر اپنا الگ کاروبار کیا جائے اور آرڈر کا دھندا چھوڑ دیا جائے۔ خود بلراج بھی اس بات کے حق میں نہ تھے کہ پتا جی بہت سا سرمایہ اس طرح لگائیں، کیونکہ وہ اپنے سر زیادہ بکھیڑے نہیں لینا

چاہتے تھے۔ اُدھر پتاجی جس ڈھنگ سے آرڈر کا بزنس کرکے روپیہ کماتے رہے تھے، وہ بہت فرسودہ ہوگیا تھا۔ مال تیار کرنے والے اب یہ چاہتے تھے کہ ایجنٹ ان کے مال کی نکاسی کے لیے باقاعدہ شوروم کا بندوبست کرے اور اپنے ہی سرمائے سے وہاں مال کا اسٹاک رکھے۔ اس مرحلے پر کاروبار کو بڑھانے کا مطلب یہ ہوتا کہ تھوک بکری کی دکان کھولی جائے۔ اس کے لیے نہ پتاجی تیار تھے، نہ بلراج۔ بلراج کے لیے آرڈر کا بزنس کرنا نسبتاً آسان تھا، کیونکہ اس میں جوکھم بھی نہیں تھا اور اس پر بازار کے اُتار چڑھاؤ کا اثر بھی نہیں پڑتا تھا۔ چنانچہ ہوا کا ساتھ نہ دینے کا انجام یہ ہوا کہ باپ بیٹے کی توقع کے برعکس معاملہ وقت سے پہلے ہی قابو سے باہر ہوگیا۔

ان حالات میں کاروبار میں بلراج کا انہماک سرسری سا ہی تھا۔ ان کا زیادہ وقت جسونت رائے، بخشی کلیان داس اور دوسرے دیرینہ دوستوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ لمبی چہل قدمی، سائیکل پر لمبی سیر، شاعری اور سیاست پر لمبی بحث، فکشن کا کثیر مطالعہ وغیرہ — ان ہی مصروفیتوں میں ان کے شب و روز بیتتے تھے۔ کالج سے واپس آنے پر بلراج کسی سنجیدہ مشغلے میں نہیں اُلجھے۔ ان دنوں زندگی ان کے لیے ہنسی، دل لگی کا نام تھا، اگرچہ یہ دور زیادہ دن تک قائم نہیں رہا۔ اس زمانے میں وہ کیسی شوخی اور زندہ دلی کے ساتھ وقت گزارتے تھے، اس کا کچھ اندازہ ایک پُرلطف واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

بلراج کے دوستوں میں بخشی کلیان داس بلراج ہی کی طرح مہم جوئی اور کھلی ہوا کی سرگرمیوں کے دل دادہ تھے۔ دونوں سائیکلوں پر سوار ہوکر ایک ساتھ نکل کھڑے ہوتے اور کبھی دیہی علاقوں میں نہانے کے تالابوں کی کھوج کرتے، کبھی مری کی پہاڑیاں ناپتے، اور کبھی یوں ہی دور تک چہل قدمی کرتے پھرتے۔ ایک روز بخشی کلیان داس کو یکایک پتہ چلا کہ ان کی مرضی کے خلاف ایک لڑکی سے ان کی منگنی کردی گئی ہے۔ وہ بہت سٹپٹائے۔ منگنی توڑنے کی ہمت ان میں تھی نہیں، کیونکہ اپنے بوڑھے تایا کو، جنھوں نے منگنی طے کرائی تھی، ناراض کرنا انھیں منظور نہ تھا۔ آخر میں بلراج اپنے نوجوان دوست کی مدد کو پہنچے۔ بخشی کلیان داس کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے بلراج نے جو ترکیب آزمائی، اس میں ان کا مخصوص، بے مثل انداز پوری طرح نمایاں تھا۔ انھوں نے بخشی کلیان داس کے بوڑھے تایا کو ایک 'گم نام' خط لکھا، جس میں ان بزرگوار سے التجا کی گئی تھی کہ لڑکی کی زندگی برباد نہ کریں اور منگنی کو فوراً توڑ دیں، کیونکہ بے چاری لڑکی کے لیے جس لڑکے کو چنا گیا ہے، وہ 'نامرد' ہے۔ یہ خط لکھ کر بلراج نے اپنے دفتر کے چپراسی کے حوالے کیا اور اسے تاکید کی کہ اسے ان بزرگوار کی جوتوں

کی دُکان پر دے آئے۔ خط منزلِ مقصود پر پہنچ گیا، مگر وہ بزرگوار اس جھانسے میں نہیں آئے۔ خطا کار کا بھی سراغ بڑی آسانی سے مل گیا، کیونکہ دکان کا ایک ملازم بلراج کے چپراسی کو پہچانتا تھا۔ اس طرح سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔ بزرگوار اسی شام کو دندناتے ہوئے ہمارے گھر آئے اور بلراج کی بیہودگی کی شکایت کرنے لگے۔ بعد میں منگنی بہرحال توڑ دی گئی، کیونکہ لڑکی کے ماں باپ کے ذہنوں میں ایک طرح کی غلط فہمی پھر بھی منڈلاتی رہی اور یہ بات حتمی طور پر ثابت کرنا آسان نہ تھا کہ بخشی کلیان داس مکمل طور پر ٹھیک ٹھاک اور صحت مند ہیں۔

لگ بھگ ان ہی دنوں بلراج کی اپنی منگنی بھی ہو گئی۔ ان کی منگیتر جسونت رائے کی چھوٹی بہن دمینتی تھیں۔ اس رشتے کی بات چیت تقریباً ایک سال پہلے شروع ہوئی تھی، جب بلراج کالج کے آخری سال میں پڑھ رہے تھے۔ جسونت رائے کا بلراج پرستش کی حد تک ادب اور احترام کرتے تھے، اس لیے جب یہ تجویز ان کے سامنے آئی تو انھیں بہت قدر افزائی کا احساس ہوا۔ لیکن صاف دلی اور صاف گوئی ہمیشہ ان کا شعار رہی تھی، اس لیے انھوں نے پہلا موقع ملتے ہی جسونت رائے پر واضح کر دیا کہ اپنی رشتے کی بہن سنتوش کے لیے وہ اپنے دل میں بے پناہ کشش محسوس کرتے ہیں۔ جسونت رائے نے بلراج کی صاف دلی اور خلوص کی داد دیتے ہوئے کہا کہ یہ محبّت نہیں صرف 'چڑھتی جوانی کی ترنگ' ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے بلراج کو اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی کہ ہندوؤں میں رشتے کی بہن سے شادی کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ جسونت رائے کا قول بلراج کے لیے قانون کا درجہ رکھتا تھا، اس لیے کم از کم یہ معاملہ وہیں ختم ہو گیا اور 6 دسمبر 1936 کو راولپنڈی میں بلراج کی شادی دمینتی سے ہو گئی۔ یہ بھید زندگی نے بعد میں کھولا کہ سنتوش کے لیے بلراج کے دل میں جو کشش تھی، وہ صرف 'چڑھتی جوانی کی ترنگ'، ہرگز نہ تھی، اور اس کے ساتھ ہندو سماج کے وہ ضابطے بھی کچھ ایسے واجب التعظیم ثابت نہ ہوئے جن کی رو سے رشتے کے بھائی بہن کی شادی ممنوع ہے۔

دمینتی بہت من موہنی لڑکی تھیں۔ سب سے محبّت سے پیش آنے والی۔ سب کی بھلائی چاہنے والی۔ خلوص کی پُتلی۔ پانچ بھائیوں اور دو بہنوں کے گھرانے میں وہ سب سے چھوٹی بیٹی تھیں، اس لیے گھر کے ہر فرد کی بھرپور محبّت اور شفقت انھیں حاصل رہی تھی اور بڑی ہو کر وہ بے حد ملنسار اور خوش مزاج نکلی تھیں۔ بلراج کی زندگی میں ان کا آنا ایسا ہی تھا جیسے سورج کی شوخ کرن آ جائے۔ دونوں کی جوڑی سچ مچ بہت پیاری تھی۔

اپنی تعلیم پوری کر کے جب میں گھر واپس آیا تو میں نے گھر کی فضا کو بہت بدلا ہوا دیکھا۔ یہ 1947 کے موسم گرما کی بات ہے۔ پتا جی پر جھلاہٹ سی سوار رہتی تھی۔ ماتا جی مجھے کسی گوشے میں کھینچ لے جاتیں اور سرگوشی میں بتاتیں کہ گھر میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود بھی کچھ کم فکر مند نہ تھیں۔ ان کا منشایہ تھا کہ میں اپنے بھائی سے بات کروں اور انھیں سمجھاؤں کہ اپنے آپ کو کچھ تو سنبھالیں۔ ایسا بھی کیا آپے سے باہر ہونا۔ خود ماتا جی کے لفظوں میں: "آخر وہ دنیا میں پہلا لڑکا تو ہے نہیں جس کی شادی ہوئی ہے۔" میں سمجھ گیا کہ نوبت کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ بلراج اور دمّو (دمینتی کو پیار میں یہی کہا جاتا تھا) اپنے غیر روایتی طور طریقوں کے باعث سارے شہر میں چرچا کا موضوع بن گئے تھے، جس کی وجہ سے ہمارے ماں باپ، دونوں بے حد پریشان رہنے لگے تھے۔

راولپنڈی ایک صوبہ جاتی شہر تھا — بالکل قصباتی انداز کا تنگ نظر شہر جہاں ہر بات ہر شخص کا اپنا معاملہ بن جاتی ہے۔ وہاں چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی چند گھنٹے کے اندر شہر کے ہر شخص کے علم میں آجاتا اور سارے شہر میں موضوعِ گفت گو بن جاتا۔ کئی پہلوؤں سے یہ شہر کافی قدامت پرست تھا۔ اس کی اپنی الگ قدریں، اپنے الگ معیار، اپنی الگ روایتیں تھیں۔ عورتوں کا وہاں اپنے شوہر کے شانہ بشانہ سڑک پر چلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہ شوہر کے پیچھے پیچھے چلتی تھیں، اور وہ بھی اس طرح کہ ان کا چہرہ کسی قدر ڈھکا رہتا تھا۔ اگر شوہر بیوی تانگے میں کہیں جارہے ہوتے تو شوہر اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ بیٹھتا اور بیوی پچھلی سیٹ پر۔ عورتوں سے یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ باہر ننگے سر پھریں یا راستے میں زور سے ہنس پڑیں، یا آزادی اور بے پروائی سے ٹہلتی نظر آئیں۔ اس لیے جب شادی کے چند ہی دنوں بعد دمینتی اس عالم میں بلراج کے ساتھ سائیکل کے کیریئر پر بیٹھی ٹوپی پارک کی طرف لمبی سیر کے لیے جاتی دکھائی دیں کہ ان کا لباس بھی انتہائی معمولی تھا اور کلائی میں سونے کی چوڑی تک نہ تھی تو انھیں ہمارے گھرانے کے جس دوست اور رشتہ دار نے بھی دیکھا، اس کا حیران اور پریشان ہو جانا فطری ہی تھا۔ شادی کے پہلے دن سے ہی دمینتی میں نئی نویلی دلہن جیسی کوئی بات نہ تھی۔ کبھی کبھی یہ جوڑا بڑے اطمینان سے شہر سے باہر کھیتوں میں گھومتا نظر آتا۔ ایک سہ پہر کو لوگوں نے انھیں ایک مال گاڑی کے کھلے ڈبے میں کھڑا دیکھا جو راولپنڈی کے مضافات میں چک لالہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ظاہر ہے، بلراج کے یہ غیر روایتی طور طریقے ہمارے ماں باپ کے لیے شدید پریشانی اور شرمندگی کا سبب بن گئے تھے۔ اور یہ دونوں تھے کہ دوسروں سے قطعی بے نیاز، ایک دوسرے میں گم تھے۔ انھیں اس بات کی ذرا بھی فکر نہ تھی

کہ لوگ ان کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ یوں سچ پوچھیے تو ان کا رویہ اور انداز بہت غیر معمولی اور انقلابی قسم کا ہرگز نہ تھا۔ کسی اور شہر میں، جو اتنا قدامت زدہ نہ ہوتا، ان کا طرزِ عمل بالکل معمول کے مطابق گردانا جاتا۔

پتاجی کو ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی۔ کاروبار میں بلراج کی دلچسپی تیزی سے ماند پڑتی جا رہی تھی۔ یہ دلیل پتاجی کو بالکل بھی مطمئن نہیں کر سکتی تھی کہ شادی کے بعد ابتدائی دنوں کے چونچلوں کا یہ عارضی دور ہے اور اس کے گزر جانے پر بلراج معمول کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ ایسی بات سنتے ہی پتاجی مایوسی سے سر ہلاتے اور کہتے کہ انھیں اندیشہ ہے کہ بلراج بزنس سے دلچسپی لیتے رہیں گے۔

بزنس کی طرف سے بلراج کی بے پروائی کا اندازہ مجھے لاہور سے واپس آتے ہی ہو گیا تھا۔ جس روز میری واپسی ہوئی، اس روز وہ راولپنڈی میں نہ تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک "ڈاڑھی والے صاحب" کے ساتھ، جن کا نام دیویندر ستیارتھی ہے، آس پاس کے دیہات سے لوک گیت جمع کرنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ ماتاجی نے یہ شکایت بھی کی کہ یہ "ڈاڑھی والے صاحب" لگ بھگ ایک مہینے سے ہمارے گھر میں مقیم تھے اور ابھی کچھ پتہ نہیں کہ وہ اور ان کا کنبہ کب تک ہمارے یہاں ڈٹا رہے گا۔

چند دن بعد دونوں آوارہ گرد، گھر آگئے۔ دونوں بہت مگن تھے، بہت جوش میں تھے کہ تھیلا بھر لوک گیت جمع کر کے لائے ہیں۔ لوک گیتوں اور لوک کتھاؤں کے میدان میں دیویندر ستیارتھی پہلے ہی کافی شہرت حاصل کر چکے تھے اور لوک گیت جمع کرنے کی مہم پر پنجاب کے علاوہ دوسرے لسانی علاقوں میں جلد ہی جانے والے تھے۔ اس وقت وہ پوٹھوہاری، لوک گیت جمع کر کے لائے تھے۔ یہ مجموعہ اس میدان میں نہایت بیش بہا عطیہ ثابت ہوا اور بلراج اس کام میں بہت ذوق و شوق اور جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔

وقت کے ساتھ بلراج کا اندرونی اضطراب رفتہ رفتہ بڑھتا ہی گیا۔ بظاہر ان کی زندگی میں ناعاقبت اندیشی اور کسی حد تک قلندری رچی نظر آتی تھی، مگر حقیقت میں ان کی وضعِ زندگی ان کی اندرونی بے قراری ہی کی غماز تھی۔ زندگی کا جو ڈھرا انھوں نے اختیار کر رکھا تھا اس سے وہ مطمئن نہیں تھے اور اسے بدلنے کے لیے ان کی بے صبری میں ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ یہی بے چینی ان کی گوناگوں تبدیلیوں کے پس پشت بھی کارفرما تھی جو اگلے چند مہینوں تک ان کی دلچسپیوں اور

مشغلوں میں اپنا جلوہ دکھاتی رہیں۔ روزگار کا جو سلسلہ انھوں نے اپنایا تھا، اس سے دل برداشتہ ہو کر وہ اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو روبہ کار لانے کے لیے اب کسی بہتر میدان کی جستجو میں تھے۔

دیویندر ستیارتھی کے ساتھ دیہات کا دورہ بلراج کے لیے بالکل نیا اور نہایت فرحت بخش تجربہ تھا۔ اب تک ان کے ادبی ذوق کو صرف انگلش لٹریچر سے غذا ملی تھی اور وہ کتابوں تک ہی محدود رہا تھا، مگر اب اسے جیتی جاگتی مقامی فضا میسّر آگئی تھی، پھر جس شخص کے ساتھ وہ دورے پر گئے تھے وہ لگن کا پُتلا تھا اور اس میدان میں ایک پیش رو کی طرح کام کر رہا تھا۔ اس لیے بلراج جلد ہی ہندی میں لکھنے لکھانے کی طرف مائل ہو گئے۔

زیادہ بڑی دنیا میں رہنے کی آرزو، اپنے ذہنی افق اور تجرباتی دائرے کو وسیع تر کرنے کی تمنا، آدمیوں اور جگہوں کے بارے میں زیادہ آگاہی حاصل کرنے کی خواہش بلراج کی فطرت میں رچی ہوئی تھی اور ان کی زندگی میں بار بار اپنی شدّت کو تسلیم کراتی تھی۔ ان کے مزاج کا سانچا ہی ایسا تھا۔ پتا جی کبھی کبھی سوچتے تھے کہ بلراج کی طبیعت میں تلوّن بہت ہے اور وہ استقلال کے ساتھ کوئی بھی کام نہیں کر سکتے۔ مگر حقیقت یہ نہ تھی۔ انھیں جو شے بے قرار رکھتی تھی اور آئے دن نئے نئے تجربے کرنے پر مجبور کرتی تھی وہ بڑھنے پھیلنے، زیادہ بھرپور زندگی بسر کرنے، زیادہ وسیع فضا میں اپنی ذات کا اظہار کرنے کی اندرونی تڑپ تھی۔

1937 کے موسمِ گرما کے آخر میں بلراج کو یکایک انگریزی میں ایک ادبی رسالہ نکالنے کی سوجھی۔ درگا پرساد دھر کے روپ میں انھیں شریکِ کار بھی مل گیا۔ دھر ان دنوں طلبا کی سیاست میں سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ رسالے کے منصوبے کے باب میں ان کے جوش و خروش کا بھی وہی عالم تھا جو بلراج کا تھا۔ جھٹ پٹ دونوں نے رسیدیں چھپوائیں اور سرمایہ جمع کرنے کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ رسالے کا نام "کُنگ پوش" تجویز کیا گیا، جو کشمیری زبان کا لفظ ہے اور جس کے معنی 'زعفران' ہیں۔ ان ہی دنوں بلراج کو مشہور کشمیری شاعر مہجور کے بارے میں علم ہوا، جو وادی کے ایک دور دراز گاؤں میں مال گذاری کے محکمے کے ملازم کے طور پر کام کرتے تھے۔ بلراج ان سے ملنے گئے، ان سے ان کی زندگی کے اہم واقعات سنے اور واپسی پر ان کے کئی مشہور گیت اپنے ساتھ لے کر آئے۔ برسوں بعد، جب بلراج فلموں میں اچھی طرح قدم جما چکے تھے تو انھوں نے مہجور کی زندگی پر ایک فیچر فلم بنانے کی ٹھانی۔ سرمائے اور دوسری سہولتوں کی فراہمی کے لیے انھوں نے کشمیر سرکار کو آمادہ کر لیا۔ ان کی پہل اور مستقل مزاجی کی بدولت یہ فلم بن ہی گئی۔ کشمیری زبان کی یہ پہلی

فیچر فلم تھی۔ بلراج کے بیٹے پریکشت نے مہجور کا رول ادا کیا۔ خود بلراج مہجور کے باپ بنے۔ گانے والی لڑکی کا رول کشوری کول نے نبھایا۔ ہدایت کار پربھات مکرجی تھے)

کشمیر میں گزارا ہوا وہ موسم گرما بہت سے اہم واقعات سے پُر رہا۔ ہمارے یہاں ان گنت مہمان آکر ٹھیرے۔ ان میں جسونت رائے، بی۔پی۔ایل۔ بیدی اور ان کی بیوی فریڈا بھی شامل تھیں۔ فریڈا کے ساتھ ان کا شیر خوار بچہ بھی تھا۔ بیدی اور فریڈا اس وقت سوشلسٹ کی حیثیت سے ہندوستانی سیاست میں قدم جما چکے تھے۔ انھوں نے لاہور سے انگریزی میں ایک سہ ماہی رسالہ بھی نکالا تھا، جس کا نام ' CONTEM PORARY INDIA ' (عصری ہندوستان) تھا۔ رواروی میں یہ خیال بھی ان کے ذہن میں اُبھرتا رہتا تھا کہ انگریزی میں ایک ہفت روزہ اخبار نکالا جائے جو سیاسی اور تہذیبی، دونوں طرح کے معاملات کا احاطہ کرے۔

ان ہی دنوں بھونانی صاحب کشمیر آئے۔ ان کے ساتھ مشہور فلم ایکٹر ڈیوڈ بھی تھے جو ان دنوں بپھرتے ہوئے جوش اور قوت کا پیکر تھے اور ابھی جوان ہی تھے۔ بھونانی صاحب ایک فلم "ہمالیہ کی بیٹی" بنا رہے تھے۔ انھوں نے بلراج کو بھی ایک رول کی پیش کش کی۔ مگر اس وقت بلراج کو فلمی کیریر اختیار کرنے کا مطلق شوق نہ تھا۔ ہاں، اتنا ضرور ہوا کہ ڈیوڈ سے ان کی بڑی گہری دوستی ہوگئی۔

ان ہی دنوں بلراج نے درگا پرساد دھر، بامزئی اور دوسرے جوشیلے شائقین کے ساتھ مل کر جیمز فلیکر کا انگریزی ڈراما "یاسمین" سری نگر میں اسٹیج پر پیش کرنے کا ارادہ باندھا۔ جھٹ پٹ ڈرامے کی نقلیں ٹائپ کی گئیں اور سری پرتاپ کالج میں ریہرسل شروع ہوگئی۔ اس زمانے میں چونکہ لڑکیوں کا رول بھی لڑکے ہی ادا کرتے تھے، اس لیے ڈرامے کی ہیروئن یاسمین کا رول ادا کرنے کے لیے بامزئی کا انتخاب کیا گیا۔

یہ تمام سرگرمیاں کم و بیش ایک ہی وقت میں جاری رہیں۔ ان سے بلراج کی اندرونی بے قراری اور روز افزوں بے اطمینانی صاف جھلکتی تھی۔ اس ساری ثقافتی ہلچل کے ذریعہ شاید بلراج تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہے تھے۔ شاید اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ بزنس کو کیریر کے طور پر اپنا کر بھی وہ اپنے لیے ذہنی آسودگی کا سامان پیدا کر سکتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح کاروبار اور اپنی اندرونی اُمنگوں میں تال میل کی راہ نکال سکتے ہیں۔ پتاجی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے تین برس تک وہ بزنس میں جمے رہے تھے، لیکن ان کا دل کہیں اور رہتا تھا اور ان کی

بے اطمینانی بڑھتی ہی جارہی تھی۔

ایک دن جوالا مکھی پھٹ پڑا۔ ہمارے گھر میں زور کا ٹکراؤ ہوا۔ وہ اگست کے آخری دن تھے۔ سارے مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ بلراج نے اچانک اعلان کر دیا کہ وہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں، تاکہ کہیں اور اپنی تقدیر آزمائیں۔ پتاجی غالباً اس قسم کا اعلان سننے کے لیے کسی حد تک پہلے سے ہی تیار تھے، اس کے باوجود انھیں دھچکا بھی لگا، اُداسی نے بھی آگھیرا۔ اس باب میں بلراج کے ذہن میں کوئی واضح منصوبہ نہ تھا کہ انھیں کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ جب بھی پتاجی ان سے اس سلسلے میں کچھ پوچھتے، ان کا جواب یہی ہوتا " مجھے اپنا آشیرواد دیجیے اور یہاں سے جانے دیجیے۔ میں یقیناً کوئی نہ کوئی کام تلاش کر لوں گا "۔ اس کے بعد نہ ختم ہونے والی بحث وتکرار میں تناؤ اور اضمحلال سے بوجھل کئی دن گزر گئے۔

پتاجی کئی وجہوں سے فکرمند تھے۔ سب سے زیادہ پریشان کن سوال تو یہی تھا کہ بلراج اپنی اور بیوی کی کفالت کیسے کریں گے۔ پتاجی خود مصیبت کے دن دیکھ چکے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا ایسی سختیاں جھیلے۔ انھیں اس لیے بھی تشویش تھی کہ بلراج اندھیرے میں چھلانگ لگانے کا تہیّہ کیے ہوئے تھے اور ٹھیک ٹھیک یہ بھی طے نہیں کر سکے تھے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔

دن گزرتے گئے۔ پتاجی کی پریشانی بڑھتی گئی۔ کبھی وہ اپنے پُرانے بہی کھاتے بلراج کو یہ ثابت کرنے کے لیے دکھاتے کہ ان کا کاروبار کتنا منفعت بخش رہا ہے۔ کبھی اس آزاد زندگی کی خوبیاں بیان کرتے جو ایک کاروباری آدمی کے نصیب میں آتی ہے۔ بار بار وہ ایک پنجابی کہاوت دہراتے جس کا مطلب ہے: " تم اپنی ہی نیند سوؤ گے "۔ کبھی دمینتی سے اصرار کرتے کہ اپنے شوہر کو سمجھا بجھا کر ناممکنات کے پیچھے بھاگنے سے باز رکھیں۔ پتاجی اور بلراج کے درمیان ہی نہیں، پتاجی اور ماتاجی کے درمیان بھی نہ ختم ہونے والی بحث کا سلسلہ چلتا رہتا۔ ماتاجی کے مزاج میں نسبتاً زیادہ ٹھیراؤ تھا۔ وہ صورتِ حال کا زیادہ متوازن جائزہ لے سکتی تھیں۔ آخر اپنے مخصوص انداز میں ایک دن وہ کہہ ہی بیٹھیں: " پرندوں کے بچّے بھی پر نکلنے پر اپنے ماں باپ کے گھونسلے سے اُڑ جاتے ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ آپ کا بیٹا اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے اتنا بے چین ہے "۔ ایک اور موقع پر وہ کہنے لگیں: " اس معاملے میں بلراج کو صرف ایک ہستی سے مشورہ لینا ضروری ہے، اور وہ اس کی بیوی ہے۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ بلراج اور اس کی بیوی کو خود ہی کرنا ہے۔ میں اور آپ دخل دینے والے کون ہوتے ہیں؟ "

مگر پتا جی ایسی باتیں کان دھر کر سنتے ہی نہیں تھے۔ ان کی پریشانی اور بے چینی بڑھتی ہی گئی۔ ایک دن جب وہ برآمدے میں بیٹھے تھے تو یکایک انھوں نے اپنی پگڑی سر سے اُتاری اور کہنے لگے: "دیکھو، کم از کم ان سفید بالوں کا تو کچھ خیال کرو۔ میں اب جوان نہیں ہو رہا ہوں۔ آخر بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے ماں باپ کے تئیں بھی تو تمھارا کچھ فرض ہے۔" مگر بلراج اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔ یہ بات نہیں کہ بلراج کو اپنے گھر والوں سے لگاؤ نہ تھا۔ لگاؤ تو انھیں اتنا تھا کہ ماں باپ کو بے ضرورت دکھ پہنچانے کی بات وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے گھر چھوڑنے سے گھر والے کس طرح دل مسوس کر رہ جائیں گے۔ لیکن اب وہ اٹل فیصلہ کر چکے تھے اور کوئی بھی ترغیب، کوئی بھی دلیل، کوئی بھی التجا انھیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ بزنس کے تصوّر سے ہی انھیں اب کراہیت ہونے لگی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ایک ایسی وضعِ زندگی کے صحرا میں وہ کافی عرصے تک بھٹک چکے ہیں جو آلکسی اور آرام طلبی کا پشتارہ تھی، بے فیض اور رائیگاں تھی۔ اس لیے اب انھیں عمل کے کسی میدان میں بہرطور کودنا ہے، اپنی راہ بنانا ہے، اپنا مقام پیدا کرنا ہے۔

جب ساری کوششوں کے باوجود پتا جی بلراج کے فیصلے کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ بلراج اپنے ارادے پر اٹل ہیں۔ جب وہ بلراج سے اپنی بات نہ منوا سکے تو خود ہی ان کی بات مان گئے، اور وہ بھی اپنے مخصوص انداز سے۔ ان کا رویّہ یک سر بدل گیا۔ وہ بلراج کی روانگی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ذرا ذرا سی بات کی انھیں فکر رہتی تھی۔ بہت دل پر اثر کرنے والا منظر ہوتا تھا جب وہ نہایت شفقت کے ساتھ معمولی نکتوں پر بھی پورا دھیان دیتے نظر آتے تھے، مثلاً یہ کہ بلراج کے پاس کپڑے کافی اور اچھے قسم کے ہوتے چاہئیں، انھیں روپے پیسے کی تنگی نہیں رہنی چاہیے، وغیرہ۔ ماں کنستر بھر پنیاں، تیار کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔ پنجابی گھرانوں میں یہ دستور عام تھا کہ جب بیٹا لمبے سفر پر روانہ ہوتا تھا تو ماں زادِ راہ کے طور پر یہ مٹھائی ڈھیر ساری مقدار میں بنا کر اس کے ساتھ کر دیتی تھی۔ پتا جی نے مختلف شہروں میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو خط لکھ دیے کہ اگر بلراج ان سے ملیں تو وہ جس طرح بھی ممکن ہو، بلراج کی مدد کریں۔ انھوں نے بلراج کے نام لیٹر آف کریڈٹ بھی نکلوا دیا، تاکہ مختلف شہروں میں بلراج بینک سے رقم حاصل کر سکیں۔ اور جب بلراج کی روانگی کا دن آیا تو پتا جی نے ایک اور بات ایسی کی جس پر ان کے منفرد مزاج

کی چھاپ تھی۔ انھوں نے بلراج کو درجن بھر پوسٹ کارڈ دیے، جن پر پتاجی کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ ہر پوسٹ کارڈ پر اس مضمون کی چند سطریں پہلے ہی لکھ دی گئی تھیں:

پوجیہ پتاجی :

بھگوان کی دیا سے میں اور دمینتی بالکل خیریت سے ہیں۔ ہماری طرف سے ذرا بھی فکر مند نہ رہیں۔

آپ کا چہیتا بیٹا

یہ سارے پوسٹ کارڈ بلراج کو دیتے ہوئے پتاجی نے کہا: "میں جانتا ہوں تم کتنے کاہل شخص ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے، کم از کم اتنا کام تو تم کر ہی لوگے۔ ہر ہفتے ایک پوسٹ کارڈ پر اپنے دستخط کر کے میرے پاس پوسٹ کر دیا کرنا۔ اس طرح مجھے معلوم ہوتا رہے گا کہ تم دونوں خیریت سے ہو۔ اس سے زیادہ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔"

20 ستمبر 1937 کو اپنی روانگی سے پہلے بلراج نے مجھے پتاجی کے کاروبار کے قاعدے، ضابطے اور طور طریقے سمجھائے۔ انھوں نے وضاحت کی کہ 'سی آئی ایف' (لاگت، بیمہ، کرایہ) اور 'سی آئی' (لاگت، بیمہ) سے کیا مراد ہے، یا 'ایف او آر بمبئی' (بمبئی پہنچتے ہوئے مال) کی قیمت کا مطلب ہے، قیمتوں کا حساب کیسے لگایا جاتا ہے، ہنڈیاں کس طرح تیار کی جاتی ہیں۔ انھوں نے انڈینٹ (آرڈر)، بیجک اور ڈیمارتج (رکے ہوئے مال پر محصول) وغیرہ کی تفصیل سے مجھے آگاہ کیا۔ اور پھر اگلی صبح کو وہ اور ان کی بیوی اس لمبی چوڑی دنیا میں اپنی قسمت آزمانے کے لیے گھر سے روانہ ہو گئے۔

لاہور

ان کا پہلا پڑاؤ لاہور تھا۔ وہاں بلراج نے پہلی (اور آخری) بار صحافت کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ ہم سری نگر سے بڑی بے چینی کے ساتھ، گویا سانس روکے ہوئے سکتہ جیسی کیفیت میں ان کی خیر خبر کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک روز یکایک (بلراج کی روانگی کے لگ بھگ مہینہ بھر بعد) بہت بڑے، زرد رنگ کے پوسٹروں کا ایک پیکٹ ہمیں ملا۔ ان پوسٹروں میں ایک نئے ہفت روزہ اخبار 'منڈے مارننگ' کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ میرے بھائی کا پہلا آزادانہ کارنامہ تھا، اس لیے بڑے جوش و خروش کے ساتھ میں ان پوسٹروں کو

اپنے علاقے کے درختوں اور گھروں کی دیواروں پر لگاتا پھرا۔ ادارتی مجلس میں شری اور شریمتی بی۔پی۔ ایل۔ بیدی، بلراج اور جگ پرویش چندر (بلراج کے ایک سابق کالج فیلو) شامل تھے۔ اگرچہ روانگی کے وقت اس ضمن میں بلراج کے ذہن میں کوئی واضح منصوبہ نہ تھا، مگر جب لاہور میں شری اور شریمتی بیدی سے ان کی ملاقات ہوئی تو اس پروجیکٹ میں، جو پہلے محض ایک سرسری سا خیال تھا، نئی جان پڑی، اور یوں اس ہفت روزہ اخبار کا آغاز ہوا۔

لاہور سے ان دنوں انگریزی کے دو روزنامے شائع ہوتے تھے۔ "ٹریبیون" قوم پرور روزنامہ تھا، جب کہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" برطانوی سرکار اور اس کی پالیسیوں کا حامی اور ہم نوا تھا۔ مگر پیر کے روز ان میں سے کوئی بھی اخبار شائع نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے یہ فرض کر لیا گیا کہ 'منڈے مارننگ' کی اشاعت اس خلا کو پُر کر دے گی اور یہ نیا اخبار دھڑا دھڑ فروخت ہوگا۔

اب اتنے زمانی فاصلے سے دیکھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ یہ جوکھم کا کام کیسی رواروی میں بے پروائی اور سادگی کے ساتھ شروع کر دیا گیا تھا۔ مدیرانِ کرام کے پاس ایک ہفت روزہ اخبار کے لیے نہ تو ضروری وسیلے تھے اور نہ علم و آگاہی۔ ان کے پاس صرف ولولوں اور نوجوانی کی شہ زوری کا سرمایہ تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ اس اخبار میں تازہ خبروں کے علاوہ ثقافتی سرگرمیوں کا جائزہ بھی پیش کیا جائے گا، کہانیاں اور نظمیں بھی ہوں گی اور سوشلسٹ افکار و نظریات کو نمایاں کرنے والے مضامین بھی ہوں گے۔

ہم بڑے اشتیاق کے ساتھ اس اخبار کے پہلے شمارے کا انتظار کرتے رہے مگر جب انجام کار پہلے شمارے کے دیدار نصیب ہوئے تو میرا دل بجھ کر رہ گیا۔ یہ ایک دو ورق کا اخبار تھا، جس میں طباعت کی غلطیوں کی بھرمار تھی۔ اس اخبار نے لاہور میں کیسا نقش قائم کیا، یہ تو ہمیں معلوم نہیں ہو سکا، مگر ہم اتنا ضرور جانتے تھے کہ یہ تماشا نہایت مایوس کن ہے، یہ آغاز نہایت حوصلہ شکن ہے۔ تاہم اس وقت ہم نے اخبار کی کوتاہیوں کو تجربے کی کمی کی دین قرار دیا اور اگلے شمارے کا انتظار کرنے لگے۔ ہفتہ بھر بعد دوسرا شمارہ آیا تو طباعت کی غلطیوں کے معاملے میں وہ پہلے شمارے سے بھی بدتر نکلا۔ ہمیں اندیشہ ہونے لگا کہ ایسے اخبار کے نصیب میں زیادہ عرصے جینا نہیں لکھا ہوگا۔ اس کے بعد چند شمارے اور آئے، لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو درخشاں مستقبل کے تو کیا، بقا ہی کے کچھ آثار ظاہر کرتا۔ پتا جی کی دلی خواہش تھی کہ بلراج اپنی اس پہلی مہم میں کسی نہ کسی حد تک

ضرور کامیاب رہیں۔ انھیں اندیشہ تھا کہ ناکام رہنے کی صورت میں بلراج بہت دل برداشتہ ہو جائیں گے۔ اسی درمیان ہمیں لاہور سے ایک رشتہ دار کا خط ملا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ایک پریس میں ان کی ملاقات بلراج سے ہوئی تھی۔ وہاں وہ فرش پر بیٹھے پروف ٹھیک کر رہے تھے۔ ان کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ بخار نے انھیں دبوچ رکھا تھا اور وہ بہت تھکے ہوئے اور نڈھال نظر آ رہے تھے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ میرے بھائی کس حال میں ہیں، پتا جی مجھے لاہور بھیجنے ہی والے تھے کہ خود بلراج کا خط ہمیں مل گیا۔ انھوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ اس اخبار کی مہم سے الگ ہو گئے ہیں اور اس علیحدگی کا انھیں کوئی پچھتاوا بھی نہیں ہے۔ ہم نے چین کی سانس لی۔ یہ اخبار سچ مچ جی کا جنجال بن گیا تھا۔ بلراج کو اس نے کافی تنگ کیا تھا — جسمانی طور پر بھی اور مالی طور پر بھی۔ اس کے علاوہ بلراج نے یہ سبق بھی جلد ہی سیکھ لیا تھا کہ وہ اس قسم کے کاموں کے لیے نہیں بنے ہیں۔ اس تجربے نے انھیں ملول تو کیا، مگر اس کے ساتھ انھیں پہلے سے زیادہ خردمند بھی بنا دیا۔

لاہور میں قیام کے دوران میں ہی بلراج نے ہندی میں کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ایک اعتبار سے وہ ہندی ادب کے اس میدان میں بالکل نئے بھی نہیں تھے۔ ان کے کئی دوست اور عزیز ہندی میں پابندی سے لکھتے آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ رشتہ دار تو ہمارے اپنے خاندان کے ہی تھے۔ مثال کے طور پر ہمارے بہنوئی چندرگپت ودّیا النکار، ہماری رشتے کی بہن ستیہ وتی ملک، اور ہماری انتہائی باصلاحیت اور حسّاس رشتے کی بہن پُروشرتھا وتی۔ بلراج نے ہندی میں زیادہ نہیں لکھا، پابندی سے بھی نہیں لکھا، لیکن جتنی بھی کہانیاں انھوں نے لکھیں، ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور بلراج کا نام باذوق لوگوں کی توجہ کھینچنے لگا۔ اس دور کی ان کی ایک کہانی "واپسی اور واپسی" ایک کشمیری کسان کی روداد ہے، جسے سری نگر میں مہاراجہ کے جنم دن کے موقع پر جیل سے رہا کر دیا جاتا ہے۔ ہری پربت (پہاڑی پر بنی ہوئی پرانی جیل جہاں وہ قید تھا) سے اُتر کر جب وہ شہر پہنچتا ہے تو سارا شہر اسے سجا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر طرف جشن کی فضا ہے۔ یہ دیکھ اس کا دل پھر اُمنگوں سے بھر جاتا ہے۔ وہ سڑکوں پر خوشیاں منانے والے ہجوم میں جا ملتا ہے اور مہاراجہ کے جنم دن کا جشن اپنے ہی خاص انداز میں منانے لگتا ہے۔ اپنی ترنگ میں مگن، خوشی سے سرشار، رات گئے وہ ایک ایسے علاقے میں جا نکلتا ہے جہاں مال دار لوگ رہتے ہیں۔ اعتماد اور آسودگی کا احساس اس کے وجود میں پھر جاگ اُٹھا ہے اور اس احساس نے اسے ایک نئی جرأت بخش دی ہے۔ وہ بے دھڑک ایک شاندار مکان میں گھس جاتا ہے، جس کے مکین

جشن دیکھنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ وہ بے جھجک ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومتا پھرتا ہے۔ ایک جگہ اسے شراب کی بوتل ہاتھ لگ جاتی ہے، جسے وہ سرخوشی کے عالم میں مزے لے کر خالی کر دیتا ہے۔ نشے کی جھونک میں وہ ناچتا ہے، گاتا ہے، رات کے پہرے داروں کی نقلیں اُتارتا ہے۔ اس دوران پہرے دار بھی اپنی ڈیوٹی پر آ چکا ہے۔ بے چارہ تقدیر کا ہیٹا کسان پھر پکڑا جاتا ہے اور جب صبح ہوتی ہے تو اسے پہاڑی پر اسی جیل کے اندر پہنچا دیا جاتا ہے جہاں سے وہ پچھلی شام کو ہی چھوٹ کر آیا تھا۔

بلراج کی کہانی میں اظہار کی جرأت اور بے باکی تھی، زندگی کی تڑپ تھی، حرارت تھی۔ وہ ایسے نئے نئے موضوعات کو اپنی توجہ کا مرکز بنا رہے تھے جن کا تعلق محض فرد کے جذبات و احساسات یا گھریلو معاملات سے نہ تھا، سماجی زندگی کے وسیع تر پس منظر سے بھی تھا۔

لاہور میں جب ان کا قیام تھا تو وہ اسٹیج کی سرگرمیوں میں بھی عملی طور پر شرکت کرتے رہے۔ ان کے پرانے کالج (گورنمنٹ کالج) کا ڈرامیٹک کلب 'THE BUILDER OF BRIDGES' (پُلوں کا معمار) کو اسٹیج پر پیش کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بلراج بھی اس منصوبہ میں شریک ہو گئے۔ اس ڈرامے کے پیش کار بلراج کے پُرانے ٹیچر ہریش کٹھ پالیا تھے۔ بلراج کی بیوی دمینتی کو اس میں ہیروئن کا رول دیا گیا تھا۔

لاہور میں بلراج کا پڑاؤ مختصر سے عرصے کے لیے ہی رہا۔ اس سے پہلے کہ انھیں پوری طرح احساس ہوتا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں، وہ اپنا مختصر سا سامان باندھ کر شانتی نکیتن کی طرف کوچ کر چکے تھے۔ ویسے وہ شانتی نکیتن پہلے نہیں پہنچے۔ ان کی اوّلین منزل تو کلکتہ تھی، جہاں بلراج کے ایک پُرانے کلاس فیلو کے بڑے بھائی اور ہندی کے ایک جوشیلے ادیب ایس۔ ایچ۔ واتسائن ان دنوں رہا کرتے تھے۔ بلراج اور دمینتی نے ان کے فلیٹ میں ڈیرا ڈال دیا اور بلراج اپنے لیے کام تلاش کرنے لگے۔

کلکتہ میں بلراج کی تحریری کاوشیں کسی قدر بڑھ گئیں۔ وہ ایک باتصویر ہفت روزہ "سچتر بھارت" کو اپنی مزاحیہ تحریریں فراہم کرنے لگے، جہاں سے انھیں ایک مضمون کا ٹھیک چار روپے معاوضہ ملتا تھا۔ بچّوں کے لیے ان کی دل چسپ کہانی "ڈھیور شنکھ" اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔

بلراج کے لیے زندگی روز بروز زیادہ صبر آزما بنتی جا رہی تھی۔ ادبی کاوشوں سے اتنی

بھی آمدنی نہیں ہوتی تھی کہ اس کا ذکر کیا جا سکے۔ اُدھر دمینتی اُمید سے تھیں۔ اس لیے جب بلراج کو معلوم ہوا کہ شانتی نکیتن میں چالیس روپے ماہوار کی معمولی تنخواہ پر ایک ہندی ٹیچر کی جگہ خالی ہے تو انھوں نے فوراً اس کے لیے درخواست دے دی۔ اور پھر تقرر ہوتے ہی وہ شانتی نکیتن چلے گئے۔ یہ 1937 کے موسم سرما کا واقعہ ہے۔ اس انداز سے یکایک شانتی نکیتن میں پہنچ جانا بلراج کے لیے ایک بالکل نیا اور ولولہ خیز تجربہ تھا۔ ان دنوں لوگ عام طور پر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کی دو راجدھانیاں ہیں: سیوا گرام اور شانتی نکیتن۔ سیوا گرام کو، جہاں باپو رہتے تھے، ہندوستان کی تحریک آزادی کا مرکز ہونے کی حیثیت سے سیاسی راجدھانی کا درجہ حاصل تھا۔ شانتی نکیتن جہاں گرو دیو ٹیگور رہتے تھے، تہذیبی دارالخلافہ تھا۔ ہندوستانی عوام کی امنگوں اور ان کی ثقافتی اور سیاسی بیداری کی لہریں شانتی نکیتن سے بھی اتنے ہی زور و قوت کے ساتھ ہو کر گزرتی تھیں جتنے زور و قوت کے ساتھ سیوا گرام سے ہو کر۔

شانتی نکیتن جس ماحول میں واقع تھا وہ بلاشبہ نظر کی جنت تھا۔ وہاں کی تہذیبی فضا بہت نکھری سنوری، کسی قدر نایاب قسم کی تھی۔ سنگیت ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ پہلے ہی دن صبح کو جب ایک سریلے نغمے سے بلراج کی آنکھ کھلی تو ان کی رگ رگ میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس وقت لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی معمول کے مطابق "دیتا لک" کے لیے نکلی تھی اور گاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ شانتی نکیتن میں کلاسیں درختوں کے سائے میں ہوتی تھیں۔ پیڑ تلے بیٹھے بیٹھے ہر شخص کو ٹیگور کی جھلک صاف نظر آ سکتی تھی، جو اپنے گھر کے برآمدے میں کرسی پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ گورا، خوب صورت، نورانی چہرہ۔ اُجلی، سفید، پھیلی ہوئی ڈاڑھی۔ بلراج بنگالی سنگیت اور خود ٹیگور کی اپنے گیتوں کے لیے بنائی ہوئی لاثانی دھنیں سن سن کر بھی مسحور ہوتے رہے تھے۔ یہاں آکر بلراج کو ایک ایسی فضا میں رہنے اور سانس لینے کا موقع ملا جو باقی سارے ہندوستان کی فضا سے الگ تھی۔ اب تک وہ جن مقامات پر رہتے آئے تھے وہاں ہر بات اور ہر شے میں انگریزی موجودگی کا احساس ہوتا تھا، فنون اور علم و فضل پر مغربی کلچر کی چھاپ صاف دکھائی دیتی تھی۔ لیکن شانتی نکیتن مثالی قسم کی ہندوستانی جگہ تھی۔ یہاں مغربی اثرات کو خانہ بدر تو نہیں کیا جاتا تھا، مگر انھیں مسلط ہونے اور غالب آنے کا موقع بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ فن کار اور ارباب فکر یہاں اپنی قوم اور اپنے عوام کی زندگی سے زیادہ قریب رہتے تھے۔ یہ زندگی کی کشمکش اور جدوجہد سے الگ تھلگ کوئی گوشۂ عافیت نہ تھا، جیسا کہ ان دنوں اس کے بارے میں عموماً کہا جاتا

تھا۔ یہاں تو ہماری پوری قوم کی اُمنگیں گونج رہی تھیں، جو تہذیبی طور پر اپنے ہی بوتے پر نشوونما پانے کی جستجو میں تھی اور اپنے کلچر کے نئے جنم کے امکانات کے احساس سے سرشار تھی۔ وہاں ایسے فن کاروں، عالموں اور انقلابیوں سے بلراج کی ملاقاتیں ہوئی جنھوں نے اپنے آپ کو ملک کی آزادی کے نصب العین کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب بلراج شانتی نکیتن میں تھے تو پہلے گاندھی جی اور ان کے بعد پنڈت نہرو نے وہاں کا دورہ کیا۔ ٹیگور کے علاوہ اور بھی بہت سی قد آور شخصیتیں شانتی نکیتن میں موجود تھیں۔ کشتری موہن سین تھے، جو دورِ وسطیٰ کی شاعری پر سند کا درجہ رکھتے تھے۔ ہزاری پرساد دویدی تھے۔ جو ہندی کے مشہور عالم اور ادیب تھے۔ نندلال بوس تھے، جو عظیم آرٹسٹ تھے اور عام آدمی کی زندگی سے اپنی تصویروں کے لیے موضوعات کا انتخاب کرتے تھے۔ بلا شبہ بلراج کے ذہن کے لیے شانتی نکیتن بہت جوش انگیز اور مالا مال کر دینے والا تجربہ تھا۔

اس زمانے میں نئی نسل کے ایسے بہت سے لوگ تھے جو ٹیگور کی شاعری کی ہنسی اُڑاتے تھے اور اسے جذباتیت اور باطنیت کا استعارہ قرار دیتے تھے اور جنھیں شانتی نکیتن "کلچر کا سرکس" نظر آتا تھا۔ لیکن بلراج نوجوانی کے سارے جوش و خروش اور آزادیٔ فکر کے بھرپور احساس کے باوجود ایسے شک پرستانہ رویّہ کے شکار کبھی نہیں ہوئے۔ کتنی ہی ایسی باتیں تھیں جنھوں نے ان کو شدت کے ساتھ متاثر کیا اور جن کا ان کی شخصیت اور اندازِ نظر پر گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے ان باتوں کے اثر کا اعتراف بھی کیا، اگرچہ وہ انھیں رومانوی رنگ میں رنگنے یا خواہ مخواہ پُرعظمت بنانے کے کبھی قائل نہیں رہے۔

اُدھر بہت دور راولپنڈی میں پتا جی ابھی تک بلراج کے بارے میں پریشان اور فکرمند تھے۔ زندگی کی بازی گاہ میں بلراج کے قدم جمنے کے آثار ہنوز نمودار نہیں ہوئے تھے اور شانتی نکیتن کے متعلق پتا جی نے جو کچھ سن رکھا تھا، اس سے ان کا اضطراب کم ہونے کی جگہ یقیناً اور بھی بڑھا ہوگا۔

ایک روز ایک سکھ نوجوان راولپنڈی میں ہمارے یہاں آیا۔ وہ مصوّر تھا اور شانتی نکیتن میں ہی رہتا اور کام کرتا تھا۔ وہ مختصر سی رخصت پر اپنے وطن آیا تھا اور بلراج نے اسے تاکید کی تھی کہ شانتی نکیتن واپس آنے سے پہلے ہم سے ضرور ملتا آئے۔ وہ نہایت سیدھا سادہ بناوٹ سے دور، نیک طبع اور نرم گفتار نوجوان تھا۔ ہماری اُمید کے عین مطابق پتا جی نے

اس پر سوالوں کی بوچھار کر ڈالی ـــــ بلراج کی آمدنی کتنی ہے ۔ وہ اور ان کی بیوی کیسے رہ رہے ہیں، شانتی نکیتن میں خالص دودھ اور گھی بھی مل جاتا ہے یا نہیں، وغیرہ ۔ نوجوان مصور پتاجی کے اندیشوں کو رفع کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتا رہا ۔ آخر میں پتا جی نے پوچھا:" وہاں لوگ دھرم کرم کے پابند بھی ہیں یا نہیں ؟ پوجا پاٹھ اور پرارتھنا بھی کرتے ہیں یا نہیں ؟ "۔ پتاجی کی نظر میں آدمی کے روزگار کے بعد سب سے زیادہ اہمیت بھگوان پر اس کے ایمان کی تھی ۔ ان کے خیال میں کسی شخص کے اخلاق استحکام اور سربلندی کی کسوٹی یہی تھی کہ وہ پابندی کے ساتھ پوجا پاٹھ کرتا ہے یا نہیں ۔ ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے نوجوان مصور نے کہا " شانتی نکیتن میں نہ کوئی مندر ہے ۔ نہ کوئی مسجد، لیکن خدا کا نام وہاں ہر طرف لیا جاتا ہے ـــــ لوگوں کے ہونٹوں پر اور ان کے دلوں میں ......" اس جواب سے پتا جی اس قدر خوش ہوئے کہ اس روز کے بعد سے شانتی نکیتن اور بلراج کے وہاں کے قیام کے بارے میں پہلے کی طرح بدگمان نہ رہے ۔

چند مہینے بعد بلراج اور ان کی بیوی مختصر سے قیام کے لیے راولپنڈی آئے ۔ دونوں سادہ، گھر کی بنی ہوئی کھادی کے کپڑوں میں ملبوس تھے ۔ بلراج بالکل بدلے بدلے نظر آرہے تھے ۔ ان کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے تراشے ہوئے تھے ۔ ٹھوڑی پر چھوٹی سی ڈاڑھی تھی ۔ ایک عجیب وضع کی ہڑ کی واسکٹ پہنے ہوئے تھے جس کا ڈیزائن انھوں نے خود ہی تیار کیا تھا ۔ ان سے مل کر پتاجی کو خوشی بھی ہوئی اور تشویش بھی ۔ خوشی اس لیے کہ ان کا بیٹا ان کے اپنے سادگی سے رہنے اور بلند خیالات رکھنے کے آدرش پر عمل پیرا تھا ۔ تشویش اس وجہ سے کہ بیٹا ابھی تک بے پتوار کی کشتی بنا ہوا تھا ۔

شانتی نکیتن میں بلراج پڑھانے کے علاوہ ہندی میں کہانیاں لکھنے میں بھی مصروف رہے ۔ "سچتر بھارت" میں ان کے مزاحیہ مضامین کا سلسلہ بھی جاری رہا ۔ ان میں سے ایک مضمون " دویدی جی ہنس رہے ہیں " جس میں ہزاری پرساد دویدی کے کردار کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا تھا، بہت ہی دلچسپ تھا ۔ ان کی کہانیاں" اودر کوٹ " اور " بسنت کیا کہے گا ؟ " اسی زمانے میں لکھی گئی تھیں ۔ کلکتہ میں وہ ہندی ادیبوں کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے بھی گئے ۔ ان کے ساتھ ہزاری پرساد دویدی بھی تھے ۔ وہاں انھوں نے کچھ کھری کھری سنانے سے بھی گریز نہ کیا ۔ ان کی ملامت کا خاص نشانہ وہ بے حد پُر تصنع اور مرصع اسلوبِ اظہار تھا جس کا

چلن اس دور کے کچھ ہندی ادیبوں کے یہاں عام تھا۔

ڈرامے سے ان کی الفت بھی پہلے ہی کی طرح برقرار رہی۔ شانتی نکیتن میں انھوں نے برنارڈ شا کا " ARMS AND THE MAN " (اسلحہ اور انسان) اسٹیج کیا۔ اس کاوش سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا، خاص طور سے پروڈکشن کی ٹیکنیک کے میدان میں، جہاں بنگالیوں کی طرف سے بہت سے نئے اور طبع زاد تصورات پیش کیے جاتے رہے تھے۔

بعد کے برسوں میں شانتی نکیتن میں اپنے قیام کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بلراج اس گفتگو کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے جو ان کے اور ٹیگور کے درمیان ہوئی تھی۔ اس بات چیت کا موضوع یہ تھا کہ تخلیقی اظہارِ ذات کے لیے ادیب کس زبان کو وسیلہ بنائے۔ بلراج اس وقت ہندی میں تو لکھ ہی رہے تھے، اس کے ساتھ کبھی کبھی انگریزی میں نظم بھی لکھ لیتے تھے یا کسی نظم کا انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کرا دیتے تھے۔ مثلاً دھنی رام چاترک کی ایک پنجابی نظم انھوں نے انگریزی میں منتقل کی تھی، جو شانتی نکیتن کی طرف سے شائع ہونے والے جریدے " وشو بھارتی " میں چھپی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے ذہن میں کوئی واضح تصور نہ تھا کہ ادیب کو کون سی زبان میں لکھنا چاہیے۔ ہاں، سرسری طور پر ان کا خیال تھا کہ تخلیقی ادیب اپنی مادری زبان میں لکھے یا کسی اور زبان میں جو اس نے سیکھ رکھی ہو، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ وہ چاہے انگریزی کو اظہار کا وسیلہ بنائے یا ہندی کو، ایک ہی بات ہے۔ مگر ٹیگور کا نظریہ اس باب میں واضح بھی تھا اور تاکید بھی۔ جب بلراج نے ٹیگور کو بتایا کہ وہ ہندی میں لکھتے ہیں، اگرچہ ان کی مادری زبان پنجابی ہے کیونکہ ہندی ہمارے عوام کی زبان ہے اور ہماری قومی زبانوں میں ایک اہم زبان شمار ہوتی ہے۔ تو ٹیگور نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا: " داشتہ کتنی ہی خوب صورت کیوں نہ ہو، بیوی کی جگہ نہیں لے سکتی "۔ پھر انھوں نے بلراج کو بتایا کہ اگرچہ وہ خود بھی اپنی نظموں کا ترجمہ انگریزی میں کرتے رہے ہیں، مگر اوّلاً انھوں نے انگریزی نظمیں کبھی نہیں موزوں کیں۔ انھوں نے گورو نانک کی شاعری کا حوالہ بھی دیا اور ان کا ایک شعر پڑھ کر کہا کہ اگر گورو نانک کسی اور زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنا چاہتے تو انھیں کس قدر دشواری پیش آتی۔

یہ نکتہ بلراج کے دل پر نقش ہو گیا۔ برسوں بعد جب وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ پنجابی زبان کی طرف متوجہ ہوئے تو گرو دیو کی نصیحت انھیں انتہائی ممنونیت کے احساس کے ساتھ بار بار یاد آتی رہی۔

شانتی نکیتن میں بلراج کے دن بہت اچھے گزرے۔ دمینتی نے شانتی نکیتن میں ہی بی۔اے کے امتحان کے لیے پڑھائی کی۔ وہیں وہ اپنے پہلے بچے کی ماں بنیں۔ بنگلہ زبان میں بلراج کی دلچسپی وہیں بڑھی اور انھوں نے اس میں کافی مہارت بھی پیدا کر لی۔ لیکن پھر ملک میں حالات نے ایک نیا موڑ لیا۔ جس کی وجہ سے بلراج کی زندگی بھی ایک نئے انقلاب سے دوچار ہو گئی۔

ہوا یہ کہ گاندھی جی کے آشیرواد کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین ان دنوں واردھا تعلیمی اسکیم کو عملی روپ دے رہے تھے۔ ان کا ہیڈ کوارٹر سیواگرام میں تھا۔ ان ہی دنوں کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ شانتی نکیتن کی طرف سے بھی وہاں اسٹال لگایا گیا اور بلراج کو اس کی نگرانی کا کام سونپا گیا۔ وہیں ان کے سامنے یہ تجویز آئی کہ وہ چاہیں تو سیواگرام میں جاکر واردھا تعلیمی اسکیم کی طرف سے شائع ہونے والے جریدے "نئی تعلیم" کے ادارتی اسٹاف میں شامل ہو جائیں۔ بلراج نے یہ تجویز فوراً منظور کر لی۔ اور اس طرح بلراج اور دمینتی شانتی نکیتن کو خیرباد کہہ کر نئی چراگاہوں کی کھوج میں، سیواگرام (واردھا) کے لیے روانہ ہو گئے، جہاں گاندھی جی رہتے تھے۔

4

سیواگرام میں

بلراج سیواگرام اپنی طرف سے پہل کرکے نہیں گئے تھے۔ اگر پہل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے فائدے کے سارے امکانات کو تصوّر کی آنکھ سے دیکھ کر آدمی مطلوبہ سمت میں بروقت قدم اُٹھائے تو اس مفہوم میں پہل کرنے کی اہلیت بلراج میں زیادہ نہ تھی۔ اکثر تو یہی ہوتا کہ وہ ایک میدانِ عمل سے بھٹک کر دوسرے میدانِ عمل میں جا نکلتے۔ قوی ارادے کے ساتھ مستحکم قدم وہ اسی وقت اُٹھاتے تھے جب صورتِ حال ان کی فطرت اور مزاج کے یک سر خلاف ہو جاتی۔ اس کے ساتھ نئے تجربوں سے دوچار ہونے، زیادہ وسیع اور زیادہ ولولہ خیز فضا میں رہنے کی تڑپ بھی انھیں چین نہیں لینے دیتی تھی۔ جب کبھی نئے ماحول میں سانس لینے، نئے نئے لوگوں سے ملنے اور نئی نئی جگہوں کو دیکھنے کا موقع ان کے سامنے آتا تو اس ترغیب سے دامن بچانا ان کے لیے مشکل ہو جاتا اور وہ اسی روز بوریا بستر باندھ کر، ایک بار بھی پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر اپنی نئی منزل کی طرف چل کھڑے ہوتے۔ کیریر یا معاشی تحفظ کی اصطلاحوں میں سوچنے کی اہلیت ان میں تھی ہی نہیں۔ ایک پیشے کو چھوڑ کر دوسرے پیشے سے وابستہ ہو جانے سے ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن ان کے کردار اور اندازِ نظر میں ایک قسم کی اندرونی استقامت ضرور تھی اور اس اندرونی استقامت پر وار کرنے والا کوئی کام انھوں نے کبھی نہیں کیا۔

بلراج کو سیواگرام جانے کا شوق اگر ہوا تو اس کا سبب لازماً یہ نہ تھا کہ ان پر حب الوطنی کا جوش سوار تھا یا انھیں بنیادی تعلیم کے نصب العین کی خدمت کرنے کی آرزو نے بے قرار کر دیا تھا۔ ان کے لیے سب سے بڑی ترغیب صرف یہ تھی کہ وہاں گاندھی جی کے قریب رہیں گے، اس شخص کے قرب کی سنسنی سے سرشار ہوں گے جو آزادی کی جدوجہد میں ہماری پوری قوم کی رہنمائی کر رہا تھا۔ بلراج گاندھی جی کی پرستش نہیں کرتے تھے اور نہ ان کی اندھا دھند پیروی کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ گاندھی جی کو خواہ مخواہ عیب جوئی اور حرف گیری کا نشانہ بنا کے قائل

بھی نہ تھے، جیساکہ ان دنوں بہت سے نوجوانوں کا شعار تھا۔ ان کی نظر میں گاندھی جی قابلِ پرستش تو نہ تھے، مگر قابلِ احترام اور قابلِ قدر یقیناً تھے۔ یوں بھی بلراج اس وقت تک سیاسی وابستگی کے میدان کے سرے پر ہی منڈلاتے رہے تھے اور تحریکِ آزادی کے مرکزی دھارے میں نہیں کودے تھے۔ وقت کی ان لہروں نے جو ہمارے ملک کی تقدیر کی تشکیل کر رہی تھیں، بلراج کو اپنی طرف مائل ضرور کیا تھا، مگر اس کے بعد بھی بلراج اپنی سرگرمیوں کا خاص میدان آرٹ اور کلچر کو ہی سمجھتے رہے تھے۔ یہ احساس بھی ابھی ان کے ذہن میں دھندلا ہی تھا کہ عمل کے ان دونوں میدانوں میں بہت قریبی رابطہ اور بہت گہرا رشتہ ہے۔

ادھر راولپنڈی میں ہم بلراج کے خطوں کے ذریعہ نئے نئے ناموں سے مانوس ہو رہے تھے: ڈاکٹر ذاکر حسین جنھوں نے بنیادی تعلیم کی اسکیم شروع کرنے میں رہنما کا رول ادا کیا تھا، آریہ نائکم جو اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی نگرانی کر رہے تھے اور "نئی تعلیم" (بلراج اسی جریدے کے لیے کام کرنے کی غرض سے سیواگرام گئے تھے) کے اڈیٹر تھے۔ بلراج سیواگرام کے بارے میں اپنے تاثرات بھی خطوں میں لکھتے رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ سیواگرام ایک سپاٹ، بنجر جگہ ہے۔ واردھا سے اس کا فاصلہ پانچ میل ہے۔ گاندھی جی کو آرٹ اور لٹریچر سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ کستوربا ہوبہو ہماری ماتاجی جیسی نظر آتی ہیں۔ سنترے سیواگرام اور اس کے آس پاس کے علاقے میں افراط سے ملتے ہیں۔ انھوں نے وہاں سنتروں کی پہاڑیاں، دیکھی ہیں۔ سیواگرام میں بجلی نہیں ہے۔ لوگ لالٹین یا تیل کے دیے سے کام چلاتے ہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بڑا قومی لیڈر سیواگرام میں آتا رہتا ہے اور یہاں بالکل عام آدمی کی طرح گھومتا پھرتا ہے ــــ اسی طرح کی بہت سی باتیں بلراج نے اپنے خطوں میں لکھیں۔

جب سے بلراج گھر سے رخصت ہوئے تھے، وہ جہاں کہیں بھی ہوتے، پتاجی ان کی خیر خبر لانے کے لیے ضرور بھیجتے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ بلراج کے حالات ٹھیک ہیں یا نہیں۔ اس کے علاوہ ان کا منشا یہ بھی ہوتا تھا کہ میں انھیں سمجھا بجھا کر گھر واپس لے آؤں اور ایک کاروباری آدمی کی اطمینان بھری زندگی بسر کرنے پر آمادہ کر لوں۔ یہ جاسوسی کی مہمیں مجھے بہت پسند آتی تھیں۔ ان کی وجہ سے مجھے بلراج کے ساتھ بشاشت اور زندہ دلی سے بھرپور چھٹیاں گزارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر میں پہنچتے ہی بلراج کو پتاجی کا پیغام سنا دیتا، رسمی طور پر ان سے چند ضروری سوالات پوچھتا، اور اس کے بعد تفریحی چھٹیوں کا دور شروع ہو جاتا۔ لمبی سیر ہوتی۔

طرح طرح کی گپ شپ چلتی۔ خیالات کا تبادلہ ہوتا۔ ایک دوسرے کے متعلق تازہ ترین معلومات حاصل کی جاتیں۔ اپنے اپنے حالات اور تجربات کا ذکر کیا جاتا۔ یوں ہی قیام کا عرصہ پر لگا کر اُڑ جاتا۔ وقت کے ساتھ پتاجی کے کاروباری زندگی پر اصرار میں کمی آتی گئی، مگر بلراج کی بے پتوار کی کشتی جیسی زندگی کے باب میں ان کی تشویش پہلے ہی کی طرح برقرار رہی۔ چنانچہ ایک بار پھر اسی طرح کی مہم پر میں 1938 کے موسم سرما میں سیواگرام بھی پہنچ گیا۔

رات گئے ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ پلیٹ فارم پر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف ایک لالٹین پلیٹ فارم پر ہوا میں جھول رہی تھی۔ یہ لالٹین بلراج کے ہاتھ میں تھی جو میری تلاش میں ٹرین کے ڈبوں میں جھانکتے پھر رہے تھے۔

تانگہ کچے راستے پر لمبے چوڑے، سپاٹ علاقے کے درمیان ہچکولے کھاتا گزرتا رہا۔ ہم دونوں اپنی ٹانگیں اوپر سکیڑے بیٹھے تھے۔ اتنے میں بلراج نے بیڑی سلگالی۔ میں نے حیران ہوکر پوچھا:

"آپ نے بیڑی کب سے پینا شروع کر دی؟"

بلراج مسکرائے۔ "یہاں تو ہر شخص بیڑی پیتا ہے۔"

"آپ گاندھی جی کے درشن روزانہ کرتے ہیں؟"

"نہیں، کبھی کبھی۔ ان کی کٹیا 'آشرم' میں ہے اور ہم لوگ 'آشرم' کے علاقے سے باہر رہتے ہیں۔" اس کے بعد بلراج نے مزید کہا: "راجن بابو اِن دنوں یہاں آئے ہوئے ہیں تم بھی ان کا دیدار کر لینا۔ چند دن پہلے راجہ جی بھی یہاں آئے تھے۔ اور تمھیں معلوم ہے، گاندھی جی وقت کی قدر اور پابندی کرنے پر کتنا زور دیتے ہیں؟ انھوں نے راجہ جی کو بھی پانچ منٹ سے زیادہ نہیں دیے۔ راجہ جی کو انھوں نے گھڑی دکھائی۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور محفل برخاست ہو گئی۔"

بلراج کی آواز میں ان کے دلی جذبات کا رنگ جھلک رہا تھا۔

تانگہ چھپر پڑی ہوئی جھونپڑیوں کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اس سے پہلے کہ مجھے علم ہوتا، دمینتی اندھیرے میں ہی دوڑی دوڑی آئیں اور مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ان کی ہنسی اردگرد کے تاریک سناٹے میں گونج اُٹھی۔

"شش، دمّو! لوگ سو رہے ہیں۔" بلراج نے کہا۔

بائیں طرف ایک جھونپڑی میں مدّھم سی روشنی ہو رہی تھی۔

"وہ ہمارا دفتر ہے" بلراج نے وضاحت کی۔ "شری آریہ نائکم ابھی تک کام کر رہے ہیں۔ وہ عموماً رات گئے تک کام کرتے ہیں"

پھر بلراج مجھے بتاتے ہیں کہ شری آریہ نائکم نے اعلیٰ تعلیم انگلستان میں حاصل کی تھی۔ وطن واپس آنے پر وہ گاندھی جی کے ساتھ ہو گئے۔ اب قومی کام کرتے ہیں اور بہت قلیل آمدنی پر گزر بسر کرتے ہیں۔

لالٹین ہاتھ میں لیے ہم ایک برآمدے کے کچے فرش پر چل رہے ہیں۔ برابر برابر کمروں کی قطار دور تک چلی گئی ہے، جن کے دروازے اِس برآمدے میں کھلتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک کمرے میں بلراج اور دمینتی رہتے ہیں۔ میرا سامان وہاں ایک طرف ڈال دیا جاتا ہے اور پھر ہم رسوئی گھر کا رُخ کرتے ہیں جو برآمدے کے دوسرے سرے پر واقع ہے۔ یہ رسوئی گھر بس برائے نام ہی ہے۔ یہ کواڑوں تک سے محروم ہے۔ اندر کچھ بکس ملا ملا کر رکھ دیے گئے ہیں، جن کے اوپر کھانا پکانے کے برتن سجے ہیں۔

دمّو میری تھالی میں اُبلے ہوئے چاولوں کا لوندا رکھ کر اوپر سے دال ڈال دیتی ہیں۔

"یہاں گوشت کوئی نہیں کھاتا" وہ مجھے بتاتی ہیں۔ "اور خیال رہے، یہاں لوگ صرف ایک ہاتھ سے، یعنی دائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں، پنجابیوں کی طرح نہیں جو دونوں ہاتھوں سے روٹی توڑتے ہیں" پھر اندھیرے میں جھانکتے ہوئے وہ کہتی ہیں: "وہاں صحن میں ایک حمام ہے۔ ہم سب اپنے برتن وہیں دھوتے ہیں۔ کھانے کے بعد ہر شخص اپنی تھالی وہاں لے جاتا ہے اور اسے دھو کر واپس رسوئی گھر میں رکھ دیتا ہے۔ آج تو خیر میں تمھاری تھالی دھو دوں گی۔ مگر کل سے یہ کام تمھیں خود ہی کرنا ہوگا۔ یہاں یہی قاعدہ ہے۔ ملازم کوئی نہیں ہے"

"اس بے چارے کو کھانا تو کھانے دو، دمّو" بلراج کہتے ہیں: "تم تو جانتی ہی ہو میرا بھائی کس قسم کا آدمی ہے۔ زیادہ کہو گی تو کچھ کھانے سے پہلے ہی اُٹھ کر تھالی دھونے کے لیے چل دے گا"

کھانا کھانے کے بعد ہم حمام کے قریب جا بیٹھتے ہیں۔ سرگوشیوں میں گپ شپ جاری رہتی ہے۔ اور آسمان کے سیاہی مائل نیلگوں سائبان پر کروڑوں، اربوں جھلملاتے ستارے ٹنکے ہوئے ہیں۔

"آج تو تم نے اپنی تھالی ہی دھوئی ہے، کل کو اپنا پاخانہ بھی صاف کرنا ہوگا۔ یہاں صفائی کے لیے مہتر نہیں ہیں اور نہ فلش کا بندوبست ہے" دمّو ہنستے ہوئے کہتی ہیں۔

اس پر بلراج ایک نئے قسم کے 'اپنی مدد آپ' کے اصول پر مبنی بیت الخلا کے بارے میں مجھے بتانے لگتے ہیں، جس کا نقشہ گاندھی جی کا تیار کیا ہوا ہے۔

"کیا گاندھی جی سے آپ کی روزانہ ملاقات ہوتی ہے ؟ " میں بلراج سے پوچھتا ہوں۔
" نہیں، صرف کبھی کبھی، یا تو ان کی پرارتھنا سبھا میں شرکت کرتے وقت، یا پھر اس وقت جب مجھے اپنے کام کے سلسلے میں ان سے کچھ پوچھنا ہوتا ہے ۔"
"کیا آپ پرارتھنا سبھا میں روزانہ نہیں جاتے ؟ "
" نہیں وہاں حاضری لازمی نہیں ہے۔ صرف آشرم کے رہنے والوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پرارتھنا سبھا میں پابندی سے شرکت کریں گے ۔"
" اندر اور باہر رہنے والوں میں فرق کیا ہے ؟ "
" آشرم کے اندر جو لوگ رہتے ہیں انھیں سخت ڈسپلن کا پابند رہنا پڑتا ہے ۔" دمّو کہتی ہیں۔
" انھیں تجرّد کی زندگی بھی گزارنا پڑتی ہے ۔" بلراج ہنس کر لقمہ دیتے ہیں۔
یکایک کہیں دور سے ایک عجیب سی آواز آنے لگتی ہے، جیسے کوئی گھنٹہ بجا رہا ہو۔
" یہ کیسی آواز ہے ؟ آپ نے سنی ؟ " میں پوچھتا ہوں۔
" یہاں ایک جاپانی بھکشو آیا ہوا ہے۔ وہی اپنا گھنٹہ بجا رہا ہے ۔"
مجھے حیرت اور الجھن میں دیکھ کر بلراج وضاحت کرتے ہیں : " ایک جاپانی بدھ راہب حال ہی میں یہاں وارد ہوا ہے۔ ہر روز وہ ایک بہت بڑے دائرے میں گاندھی جی کی کٹیا کا طواف کرتا ہے۔ ایک پھیرے میں وہ لگ بھگ آٹھ میل کا دائرہ طے کرتا ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنی 'پریکرما' (طواف) کر رہا ہے۔ شام تک وہ جتنے پھیرے پورے کر سکتا ہے، کرتا ہے، اور پھر ٹھیک وقت پر پرارتھنا سبھا میں شریک ہونے کے لیے آجاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ رات کو بھی 'پریکرما' میں مشغول رہتا ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھو تو حیران رہ جاؤ کہ وہ گاندھی جی کی کتنی تعظیم کرتا ہے ۔"
رات کے اتھاہ سناٹے میں، دور دور تک پھیلے ہوئے دیہی علاقے کے اوپر تیرتی ہوئی گھنٹے کی آواز ہمارے کانوں میں آتی رہتی ہے۔ گھنٹہ مسلسل بج رہا ہے۔ ہوا کی لہروں پر سوار آواز کبھی ہمیں واضح طور پر سنائی دیتی ہے، کبھی گھٹی گھٹی اور مدھم سی معلوم ہوتی ہے۔
" میں نے ایک اور کہانی لکھی ہے ۔" بلراج جوش بھرے لہجے میں مجھے بتاتے ہیں۔
" عنوان کیا ہے ؟ "
" دِبی گدگدی ۔ کل میں یہ کہانی تمھیں سناؤں گا۔ پھر بتانا کہ تمھیں کیسی لگی ۔" وہ کہتے ہیں اور

پھر مجھ سے پوچھتے ہیں: "تم نے بھی کی 'تشانمنترن' پڑھی؟"
" نہیں ہاں، اس کے بارے میں سنا ضرور ہے۔"
" میرے پاس یہ کتاب موجود ہے۔ گیتوں کا بہت اچھا مجموعہ ہے۔"
سونے کے لیے جانے سے پہلے ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ اگلے دن صبح کی چہل قدمی میں ہمیں گاندھی جی کا ساتھ دینا ہے۔ برادج کہتے ہیں: "ہر شخص اس چہل قدمی میں ان کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔ میں ان سے تمہارا تعارف بھی کرا دوں گا۔" پھر ہنستے ہوئے مزید کہتے ہیں "یہاں ایک کالے رنگ کا 'آشرم داسی' ہے۔ وہ روزانہ گاندھی جی کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے جسم سے زور کی بدبو آتی ہے۔ جب کبھی وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص بہت دیر سے گاندھی سے چپکا ہوا ہے تو وہ اس شخص کے پہلو بہ پہلو چلنے لگتا ہے اور اس کے بعد چند لمحوں کے اندر وہ شخص خود ہی پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہ اہنسا وادی طریقہ گاندھی جی نے انٹرویو اور بات چیت کو مختصر رکھنے کے لیے ایجاد کیا ہے۔"
" مگر کیا گاندھی جی کو اس 'آشرم داسی' کے جسم سے پھوٹنے والی بدبو کا احساس نہیں ہوتا؟"
" گاندھی جی میں سونگھنے کی حس ہے ہی نہیں۔"
" جو کچھ تمہارے بھائی کہہ رہے ہیں، اس پر آنکھیں بند کر کے ایمان ہرگز نہ لانا۔" دمّو چہک کر مداخلت کرتی ہیں۔ " یہ تو طرح طرح کی کہانیاں گھڑنے میں ماہر ہیں۔"
" میں تمھیں شام کی پرارتھنا سبھا میں لے جاؤں گا۔ صبح کی پرارتھنا سبھا سویرے چار بجے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس میں شامل ہونا خارج از بحث ہے۔ یوں بھی شام کی سبھا میں بہت زیادہ لوگ حاضری دیتے ہیں۔ وہاں تم کستور باجی کو بھی دیکھ سکو گے۔ وہ بالکل ہماری ماتا جیسی ہیں۔ ان ہی کی طرح اپنے ننھے منے ہاتھ جوڑ کر گود میں رکھے رکھے بیٹھتی ہیں۔ اور ٹھیک ماتا جی ہی طرح پرارتھنا کے دوران میں اپنی آنکھیں بار بار کھولتی ہیں۔"
" اور گاندھی جی پر نکتہ چینی بھی کرتی رہتی ہیں۔" دمّو اضافہ کرتی ہیں۔ " ایک مزے کی بات سنو۔ میں جب ان سے ملی تو ان سے کہنے لگی کہ میں آشرم کے اندر رہنا چاہتی ہوں۔ بولیں: بے کار کی باتیں نہ کرو۔ جہاں رہ رہی ہو وہیں اپنے پتی کے ساتھ رہتی رہو۔ تمہارے آشرم میں رہنے کی بات باپو مان بھی گئے تو میں نہ مانوں گی۔"
صبح ہو چکی ہے۔
میں برآمدے میں کھڑا بڑے اشتیاق اور بے چینی کے ساتھ اس لمحے کا انتظار کر رہا ہوں جب

گاندھی جی صبح کی چہل قدمی کے لیے جاتے ہوئے اس راہ سے گزریں گے۔ بلراج ابھی سو ہی رہے ہیں۔ صبح کو بہت جلد اُٹھ جانا ان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ہوا میں کافی خنکی ہے۔ بائیں طرف کچھ دوری پر سیواگرام کا گاؤں واقع ہے، جو ڈھلواں چھپّروں والی جھونپڑیوں کے ایک جھرمٹ کا نام ہے۔ دور تک پھیلا ہوا بڑی منظر سر سبز اور شاداب نظر آرہا ہے۔ تاڑ اور کھجور کے درختوں نے افق پر گل بوٹے بنا رکھے ہیں۔ وہ تنگ اور گرد آلود سڑک جس سے ہو کر رات کو میں وادھا سے آیا تھا، دور کے ٹیلوں اور پہاڑیوں کے درمیان اور قریب آکر سیواگرام کے گاؤں میں سفید پٹی کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ کھیتوں کی حد بندی بہت سلیقے سے کی گئی ہے اور وہ بالکل ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے کوئی سرکاری فارم ہو۔

یہاں صبح کو چائے کی پیالی ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ چائے کی دکانیں یہاں ہیں ہی نہیں۔ یہاں صبح کو اخبار بھی کوئی نہیں پڑھتا۔ اخبارات سہ پہر کو آتے ہیں۔ کرسیاں یا بنچیں مجھے یہاں کہیں بھی نظر نہیں آئیں۔ سارے کام یہاں فرش پر آلتی پالتی مار کر یا چٹائی پر بیٹھ کر ہوتے ہیں۔ بلراج نے مجھے یہ بھی بتا دیا ہے کہ آشرم کے اندر بیڑی، سگریٹ وغیرہ کوئی بھی شخص نہیں پی سکتا۔ صرف چند افراد (مثلاً مولانا آزاد اور پنڈت نہرو) کو اس بات میں چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ پورا علاقہ کچھ زیادہ ہی سادہ، غیر آراستہ اور سخت کوشی کا مرقع بنا ہوا ہے۔ پھولوں کی کیاریاں یہاں شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملیں۔

اوہو! گاندھی جی آرہے ہیں! خوشی کی لہر میرے سارے جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ ہاتھ میں پتلی سی لاٹھی۔ پہلو میں جھولتی ہوئی ان کی مشہور و معروف گھڑی جسم کسی قدر نازک اور لاغر۔ وہ بالکل ایسے ہی نظر آرہے ہیں جیسے اپنی ان تصویروں میں نظر آتے ہیں۔ جو میرے لیے خاصی جانی پہچانی ہیں۔ میں اُداس اور آزردہ ہو جاتا ہوں، کیونکہ بلراج ابھی تک نہیں جاگے ہیں اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اکیلا ہی بڑھ کر اس ٹولی سے جا ملوں جو سڑک پر دھیرے دھیرے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔

جب ٹولی بہت دور پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہونے لگتی ہے تو بلراج لپکے ہوئے برآمدے میں آتے ہیں اور کہتے ہیں "تم نے مجھے اٹھا کیوں نہیں دیا؟" پھر دور نظریں جماتے ہوئے مجھے دلاسا دیتے ہیں: "خیر، ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم ان سے اس وقت مل لیں گے جب وہ واپس آرہے ہوں گے۔ وہ سامنے ٹیلا دیکھ رہے ہو؟ اس کے قریب ایک جھونپڑی میں ایک

ٹی بی کا مریض رہتا ہے۔ گاندھی جی ہر روز صبح کو اس سے ملنے جاتے ہیں اور کچھ دیر تک اس سے باتیں کرتے ہیں۔"

ہم ٹولی سے جا ملنے کے لیے چل کھڑے ہوتے ہیں اور اس سے پہلے کہ ٹولی کا واپسی کا دور شروع ہو، ہم اسے جا لیتے ہیں۔ ٹی بی کا مریض جھک جھک کر گاندھی جی سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ کوئی معمولی کانگریس ورکر معلوم ہوتا ہے۔ میں سننا چاہتا ہوں کہ گاندھی جی کیا کہہ رہے ہیں، مگر دونوں گجراتی میں بات چیت کر رہے ہیں اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

ٹولی اب واپس ہو رہی ہے۔ بلراج آگے بڑھ کر گاندھی جی سے کہتے ہیں،" باپو، یہ میرا بھائی ہے۔ کل رات ہی آیا ہے۔"

گاندھی جی مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتے ہیں تو میرا دھیان ان کے چشمے کے پیچھے ان کی آنکھوں پر جاتا ہے، جن میں نیلاہٹ سی موج مار رہی ہے۔

" تو تم انھیں بھی یہاں گھسیٹ لائے" گاندھی جی یہ کہتے ہوئے دبی دبی ہنسی ہنستے ہیں۔

" نہیں باپو، یہ تو بس میرے ساتھ چند دن گزارنے کے لیے یہاں آیا ہے۔"

خاکی نیکر اور موٹی، ہاتھ کی بُنی ہوئی کھدّر کی قمیض پہنے ہوئے بلراج خاک میں اٹی ہوئی سڑک کے کنارے کنارے چل رہے ہیں۔ میں گاندھی جی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہوں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ ان کا قد کتنا چھوٹا ہے۔ میں ان کے قد کا اپنے قد سے مقابلہ کرتا ہوں۔ ان کے خاک آلود پیروں اور چپلوں کا بھی میری آنکھیں غور سے جائزہ لیتی ہیں۔

گاندھی جی سے بات چیت کرنے کے لیے مجھے کوئی موضوع نہیں سوجھتا تو میں انھیں یاد دلاتا ہوں کہ ایک بار وہ ہمارے آبائی شہر راولپنڈی میں بھی آئے تھے۔ یہ برسوں پہلے کی بات تھی، جب کوہاٹ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ اس فساد کے فوراً بعد وہ راولپنڈی پہنچے تھے۔ میرے یاد دلاتے ہی ان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔" اُفوہ، اُن دنوں میں کتنا کام کر لیتا تھا۔ کبھی تھکتا ہی نہ تھا۔" یہ کہہ کر وہ اس وقت کی یادیں تازہ کرنے لگتے ہیں۔ انھیں راولپنڈی کے کمپنی باغ کا نقشہ اچھی طرح یاد ہے۔ اس باغ کے سامنے کا وہ مکان بھی انھیں یاد ہے جہاں انھوں نے قیام کیا تھا۔ بہت سے نام بھی ان کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ایک وکیل جان صاحب کے بارے وہ پوچھتے بھی ہیں۔ یہ دورہ انھوں نے اٹھارہ برس پہلے کیا تھا، اور پھر بھی اتنی بہت سی باتیں

انھیں آج بھی یاد ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔

"میرا خیال ہے کوہاٹ سے واپسی پر ہی ہماری فرّاٹے بھرتی ہوئی کار کا دروازہ اچانک کُھل گیا تھا اور گاندھی جی باہر سڑک پر جا گرے تھے۔" ہمارے پیچھے کوئی شخص اونچی، حلق سے نکلنے والی آواز میں کہتا ہے۔ میں پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں۔ یہ مہادیو ڈیسائی ہیں۔ گاندھی جی کے سکریٹری، لمبے تڑنگے اور بھاری بھرکم۔ ہاتھ میں ایک لمبی، موٹی سی لاٹھی سنبھالے ہوئے۔

جلد ہی گاندھی جی مہادیو ڈیسائی سے بات چیت کرنے میں کھو جاتے ہیں اور میں پیچھے کھسک آتا ہوں۔۔۔۔

شام ہو چلی ہے۔ بلراج کے کمرے کے سامنے، سڑک کے کنارے ایک نوجوان دیہاتی لڑکا بیٹھا ہے۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا ہے۔ اس کا تمتمایا ہوا سانولا چہرہ پسینے سے شرابور ہے۔ بار بار وہ اپنے سر کو اِدھر اُدھر جھٹکتا ہے اور فریاد کرتا ہے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کوئی باپو کو اس کے پاس جلدی لے آئے۔ کچھ لوگ اس کے اِردگرد آ کھڑے ہوتے ہیں اور اسے بتلاتے ہیں کہ اس وقت باپو ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہیں اور ان کی مصروفیت میں خلل ڈالنا ٹھیک نہ ہوگا۔ لڑکا بار بار اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے، چند قدم باپو کی کٹیا کی طرف بڑھتا ہے اور پھر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ گاندھی جی کھیت پار کر کے ہماری طرف چلے آرہے ہیں۔ کھیت کی ناہموار زمین پر چلنے میں انھیں کچھ دشواری پیش آرہی ہے، مگر وہ رکتے نہیں۔ سر کو دھوپ سے بچانے کے لیے انھوں نے اسے سفید کپڑے سے ڈھک رکھا ہے۔ معمول کے مطابق ان کی پتلی سی لاٹھی ان کے ساتھ ہے۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ اس بیمار دیہاتی لڑکے کی دیکھ بھال کرنے کی خاطر وہ ایک اہم میٹنگ سے اُٹھ کر چلے آئے ہیں۔

لڑکے کے قریب پہنچتے ہی گاندھی جی اس سے پوچھتے ہیں: "تمھیں کیا ہوا ہے؟"

لڑکا اپنے سر کو زور زور سے جھٹکتا ہے اور کہتا ہے: "میں مر رہا ہوں، باپو۔"

گاندھی جی چند لمحے تک غور سے اس کا جائزہ لیتے ہیں، ہاتھ سے اس کے جسم کی حرارت کا اندازہ لگاتے ہیں، پھر اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہی وہ ہنس پڑتے ہیں اور کہتے ہیں: "دیکھو اپنی دو انگلیاں اپنے منھ کے اندر گہرائی تک لے جاؤ اور جو کچھ تمھارے پیٹ میں ہے اسے باہر اُگل دو۔ معلوم ہوتا ہے تم نے گنّے کا رس بہت زیادہ پی لیا ہے۔"

لڑکا باپو کی ہدایت پر عمل کرتا ہے۔ الٹی کرتے ہی وہ زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ اب وہ کافی سکون محسوس کر رہا ہے۔ گاندھی جی ایک دو منٹ تک اور انتظار کرتے ہیں اور پھر دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہتے ہیں: "تم تو بالکل پگلے ہو۔" یہ کہہ کر وہ اپنی کٹیا کی طرف جانے کے لیے مڑ جاتے ہیں۔

ایسی ہے یہ جگہ اور ایسا ہے وہ ماحول جہاں بلراج رہ رہے ہیں۔ یہاں اس طرح کی کوئی بات نظر نہیں آتی جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ یہ جگہ ہماری آزادی کی جدوجہد کا مرکز ہے، دل ہے، روح ہے۔ بظاہر یہ کچھ زیادہ ہی پُرسکون اور خاموش اور سپاٹ ہے۔

"کیا آپ سیاسی سرگرمیوں کے میدان میں اُترنے والے ہیں؟" میں بلراج سے پوچھتا ہوں۔ اس وقت ہم بلراج کی جھونپڑی کے سامنے لان میں گھاس پر بیٹھے ہیں۔

"نہیں، سیاسی کام کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں صرف ثقافتی کام کروں گا۔ میں ادیب بننا چاہتا ہوں۔"

"پھر آپ سیوا گرام کیوں آئے؟ وہاں شانتی نکیتن میں ہی کیوں نہ رہتے رہے؟"

"معلوم نہیں ..... ویسے ادیب بننے کے لیے شانتی نکیتن میں رہنا ضروری تو نہیں ہے۔ یوں بھی سیوا گرام آنے کے تصور میں کشش تھی، میں اس سے دامن نہیں بچا سکتا تھا۔ اتنا اچھا موقع میرے سامنے آیا تھا۔ پھر میں اس سے فائدہ کیوں نہ اُٹھاتا؟ لیکن یہ طے ہے کہ میں سیاسی کام کے لیے موزوں نہیں ہوں۔"

یہ سوچنا غلط ہوگا کہ بلراج اس باب میں تذبذب اور الجھن کے شکار تھے۔ ان کا یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ وہ کسی غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ ان کا ذہن واضح طور پر اس نظریہ کو قبول کر چکا تھا کہ ادیب کوئی گوشہ نشین سنیاسی نہیں ہوتا اور اسے زندگی کے دھاروں سے، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں سے دور اور الگ تھلگ رہنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان سرگرمیوں میں وہ عملی حصّہ نہ لے۔ اُس مرحلے پر بھی وہ لکھنے لکھانے کو ایسا مشغلہ نہیں سمجھتے تھے جو مکمل تخلیہ اور گوشہ نشینی کا طلب گار ہو۔ یہ درست ہے کہ سیوا گرام آنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ادیب کے طور پر مشاہدہ اور تجربہ کریں۔ دراصل ان کے اندر چھپے ہوئے فن کار کی جبلّی تحریک ہی تھی جس نے انھیں ہمارے ملک میں اُٹھنے والے طوفان کے سرچشمے سے قریب ہونے پر مجبور کیا تھا۔ چند برس بعد ہی وہ سیاسی سرگرمیوں سے نزدیک تر ہو گئے اور وہ بھی جان بوجھ کر، اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے، کیونکہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ سیاسی سرگرمی اور ثقافتی سرگرمی

کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سیوا گرام کی زندگی کا تجربہ بعد کے برسوں میں ان کے بہت کام آیا۔ فن کار کی حیثیت سے بعد میں انھوں نے جو اندازِ نظر اپنایا، اس کی تشکیل میں اس تجربے کا بھی بہت اہم حصّہ رہا۔ اس سے ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی، عوام کی اُمنگوں سے قریبی آگاہی حاصل ہوئی، زندگی کی زیادہ گہری سوجھ بوجھ ہاتھ لگی، درد مندی کا جذبہ زیادہ قوی بنا۔

"اگر ٹیگور، اور گاندھی میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا موقع دیا جائے تو آپ کس کی رفاقت میں رہنا زیادہ پسند کریں گے؟" میں ان سے یکایک پوچھ بیٹھتا ہوں۔

"واہ؟ تم نے بھی کیا سوال پوچھا ہے!" وہ کہتے ہیں۔

"ذرا دیر کو فرض کر لیجیے ــــ اگر ایسا مرحلہ سامنے آجائے تو؟"

"بھئی، ظاہر ہے میں گاندھی جی کے ساتھ رہنے کو ترجیح دوں گا۔"

"مگر آپ ان کی ایسی باتوں کے قائل تو ہیں نہیں جو انھیں اس حد تک پسند ہیں کہ خبط کے زمرے میں آسکتی ہیں، مثلاً کھادی، نفس کشی، سخت کوشی وغیرہ؟"

بلراج چند لمحے خاموش ہو جاتے ہیں، پھر کہتے ہیں: "دراصل گاندھی جی کے ایسے من پسند اصولوں کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ گاندھی جی کا جائزہ ان کی اس طرح کی چھیتی ترنگوں کی بنیاد پر نہیں لینا چاہیئے۔" بلراج کسی قدر جوش میں آجاتے ہیں اور اپنی بات پوری کرتے ہیں۔ "تمھیں معلوم ہے، جب گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے تو برطانوی وزیر اعظم نے انھیں ڈرانے دھمکانے کی کتنی کوشش کی تھی؟ ایک استقبالیہ میں برطانوی وزیر اعظم نے گاندھی جی سے کہا: "مسٹر گاندھی، ہمارے پاس اتنا گولا بارود ہے کہ اگر ہم چاہیں تو آپ کی ساری تحریک کو ایک دن میں فنا کر دیں گے۔" اس پر گاندھی جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "مسٹر پرائم منسٹر، ہماری قوم آپ کے گولے بارود سے بالکل اسی انداز سے کھیلے گی جیسے دیوالی کے تیوہار پر ہمارے بچے پٹاخوں سے کھیلتے ہیں۔"

میں بلراج کو دیکھتا ہوں۔ اندرونی تاثر کی شدّت ان کے چہرے سے جھلک رہی ہے۔ جذبات کا جوار بھاٹا ان کے وجود میں سر پٹکتا پھر رہا ہے، میں اس کا احساس بخوبی کر سکتا ہوں۔ گاندھی جی ان کی نظر میں اس طوفانِ بے پناہ کی علامت ہیں جو سارے ملک کو زور و قوّت بخشتے ہوتے ہے اور جس کے آہنگ پر بلراج کا اپنا دل بھی دھڑک رہا ہے۔

ایک سال گزر چکا ہے، منظر بدل گیا ہے۔ بلراج سیواگرام سے واپس آگئے ہیں اور اب انگلستان جانے والے ہیں۔ وہاں انھیں ایک نیا کام مل گیا ہے۔ وہ بی بی سی سیکشن میں اناؤنسر کا منصب سنبھالیں گے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان میں ایسی کوئی تبدیلی آگئی ہے جس سے مجھے چڑ ہوتی ہے۔ وہ اور میں تانگے میں بیٹھے چھاؤنی کی طرف جارہے ہیں۔ وہاں انھیں محمد اسماعیل کی دکان پر کچھ اونی سوٹ سلوانے ہیں۔ محمد اسماعیل بہت نفیس وضع کے کپڑے سینے والا اور بہت مہنگا درزی ہے۔ میں اس تصور سے ابھی تک سمجھوتا نہیں کرسکا ہوں کہ بلراج اور بھی کہیں نہیں، سیدھے انگلستان جارہے ہیں، اسی ملک کی خدمت کرنے پر کمربستہ ہیں جس سے ہمارے عوام لڑ رہے ہیں — اور وہ بھی اس امر کے باوجود کہ وہ اتنے دن تک گاندھی جی کے ساتھ رہ بھی چکے ہیں، کام کر بھی چکے ہیں۔

"کیا آپ اپنے سوٹوں کے لیے برطانیہ میں بنا ہوا کپڑا خریدیں گے؟" میں دبی دبی جھلاہٹ کے ساتھ بلراج سے پوچھتا ہوں۔

"مجھے برطانوی کپڑے کا کچھ ایسا شوق نہیں ہے۔ لیکن اگر اچھا ہندوستانی کپڑا نہ ملا تو مجھے برطانوی کپڑا خریدنے میں عار بھی نہیں۔"

"اتنے برس تک تو آپ کھادی پہنتے رہے ہیں۔ اب برطانوی کپڑے کے سوٹ کیسے پہن سکیں گے۔"

"مجبوری ہے۔ انگلینڈ میں کھادی تو میں پہن نہیں سکتا۔ جس ملک میں مجھے رہنا اور کام کرنا ہے، وہیں کا لباس بھی مجھے پہننا چاہیئے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ آدمی کو ہمیشہ موزوں قسم کے کپڑے پہننا چاہئیں۔"

"آپ کو انگریزوں کی خدمت کرنے کا خیال کیسے آیا؟ آخر گاندھی جی کیا سوچیں گے؟"

"میں گاندھی جی کی مرضی سے اور ان کی منظوری حاصل کرنے کے بعد ہی آیا ہوں۔ میں سیواگرام سے بھاگا نہیں ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بی بی سی میں کام کرنے کے لیے لے جانے کی اجازت گاندھی جی سے خود لائنل فیلڈن نے مانگی تھی۔"

یورپ میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ لائنل فیلڈن جو آل انڈیا ریڈیو میں ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کرتے رہے تھے، بی بی سی میں ایک ہندوستانی سیکشن کا بندوبست کرنے کے لیے انگلستان واپس جارہے تھے۔ چونکہ وہ گاندھی جی کے گرم جوش پرستار تھے، اس لیے رخصتی ملاقات کے لیے سیواگرام پہنچے تھے۔ گاندھی جی سے بات چیت کے دوران میں ہی انھوں نے بلراج کو اپنے ساتھ

لے جانے کا ذکر بھی چھیڑا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نئے ہندوستانی سیکشن میں ایک اناؤنسر بلراج ساہنی بھی ہوں۔

اگرچہ ہندوستان میں ان دنوں بے چینی اور بے اطمینانی کی سرکش لہریں ہر طرف بکھر رہی تھیں، مگر اس کے ساتھ کانگریس کی قیادت یورپ میں فاشزم کے عروج سے بھی پریشان اور فکرمند تھی۔ اسی لیے فاشی جرمنی سے ٹکراؤ میں کانگریسی رہنماؤں کی ہمدردی اور حمایت جمہوری طاقتوں کے ساتھ ہی تھی۔ کانگریسی جماعت فاشیت کی مخالف طاقتوں کی اخلاقی حمایت تو کر رہی تھی، وہ اس شرط پر ان کی عملی مدد کرنے کو بھی تیار تھی کہ برطانوی حکومت جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کو آزاد کرنے کی ضمانت دے دے۔ اس طرح جنگِ عظیم ایک بین الاقوامی معاملہ بن گئی تھی۔ اس کی لپیٹ میں ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات ہی نہیں، ساری دنیا میں جمہوریت کا مستقبل بھی آ گیا تھا۔

1940 میں بلراج اور دمینتی انگلستان روانہ ہو گئے۔ ان کا ننھا سا بیٹا پریکشت جو چند مہینے پہلے (جولائی 1939 میں) مری میں پیدا ہوا تھا، ہماری ماتا جی کے پاس ہی رہا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے ایسی جگہ ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا جہاں جنگ کی وجہ سے حالات انتہائی غیر معمولی ہوتے جا رہے تھے۔ حالات کی ابتری کا یہ عالم تھا کہ جس روز بلراج اور دمینتی لندن پہنچے، اسی روز سینٹ پال چرچ اور انگلستان کی دوسری جگہوں پر ہٹلر کی طرف سے پہلی بمباری ہو گئی۔

بلراج کے جانے کے بعد راولپنڈی میں ہمارے خاندان کا نقشہ بھی بدل گیا۔ ماتا جی بلراج کے ننھے سے بیٹے کی ہو کر رہ گئیں۔ شام کو وہ ریڈیو کے پاس جم کر بیٹھ جاتیں۔ یہ ریڈیو دمینتی کے جہیز میں آیا تھا۔ ماتا جی کی آسانی کے لیے اس کی سوئی اس طرح لگا دی گئی تھی کہ بٹن دباتے ہی بی بی سی کا پروگرام سنا جا سکے۔ آدھے گھنٹے کے اس پروگرام میں جب کبھی بلراج کی آواز کوئی اعلان کرتی، ماتا جی کان لگا کر سنتیں۔ پتا جی نے معمول کے مطابق بلراج کو ان کی روانگی کے وقت اپنے پرانے مال بھیجنے والوں اور صنعت کاروں کے نام خطوط لکھ کر دے دیے تھے۔ اس کے بعد بھی وہ ان لوگوں کو خط لکھتے رہتے تھے کہ ان کے بیٹے کی ہر ممکن مدد کریں۔ اگلے چار برس تک بلراج اور دمینتی کا قیام انگلستان میں ہی رہا، اور اس پورے عرصے میں ماتا جی کا نظام الاوقات ایک دن کے لیے بھی نہیں بدلا۔ کوئی دن بھی ایسا نہیں گیا جب انھوں نے وقت پر ریڈیو کا سوئچ نہ دبایا ہو، اگرچہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بلراج کی آواز ہر روز نہیں سنی جا سکتی۔

5

انگلستان سے واپسی

بلراج کو انگلستان گئے ہوئے چار سال گزر چکے تھے۔ 1944 کے موسم گرما کا دور دورہ تھا۔ انگلستان سے بلراج کی واپسی کا سارے گھر کو انتظار تھا۔ اب میں وقت کی رہ گزر پر پیچھے مڑ کر بلراج کی زندگی کے اُن برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ بلراج کا انتظار ہی کرتے رہتے تھے ــــ یا تو ان کے کہیں سے آنے کا انتظار یا پھر کہیں جانے کا انتظار۔ اور جب بھی بلراج گھر آتے تھے، کوئی نہ کوئی خوش گوار تبدیلی ان میں ضرور نظر آتی تھی۔ جب میں اپنے والدین اور دوستوں اور رشتہ داروں کے ہجوم کے ساتھ راولپنڈی کے ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا تو یہی سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں اس بار بلراج کس انداز سے بدلے ہوں گے۔ ہم فرنٹیر میل کا انتظار کر رہے تھے جو انھیں لے کر آنے والی تھی۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور ان کی ننھی سی بیٹی شبنم بھی آ رہی تھی، جو لندن میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ بار بار مجھے یہی خیال آ رہا تھا کہ معلوم نہیں آج وہ ہمیں کس ڈھنگ کی حیرت سے دوچار کریں گے۔

راولپنڈی جیسے چھوٹے شہر میں اس زمانے میں انگلستان سے بیٹے کی واپسی بلاشبہ دھوم مچا دینے والا واقعہ تھی۔ چنانچہ بہت بڑی تعداد میں دوست اور رشتہ دار ہاتھوں میں ہار لیے بلراج کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ پتاجی کا سماجی وقار پہلے ہی دوبالا ہو چکا تھا۔ آخر ان کا بیٹا انگلستان سے واپس آ رہا تھا۔

ٹرین بھاپ کے مرغولے چھوڑتی ہوئی پلیٹ فارم سے آ لگی۔ مگر جب بلراج ٹرین سے اُترنے لگے تو ان کا حلیہ دیکھ کر ہم میں سے اکثر لوگوں کے دل کچھ بجھ کر رہ گئے۔ پہلی مایوس کن بات تو یہی تھی کہ وہ فرسٹ کلاس کے نہیں، سیکنڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑے تھے۔ پھر اُمید کے برعکس ان کی وضع قطع بھی مرعوب کن نہ تھی۔ وہ زردی مائل ہرے رنگ کا نیکر اور موٹے سوتی کپڑے کی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں معمولی چپل تھے۔ ایسے شاندار موقع

کی مناسبت سے جائزہ لینے پر بلراج ضرورت سے زیادہ ہی سادہ نظر آرہے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کے دانتوں کے درمیان پائپ بھی دبا ہوا نہیں تھا! اس دور میں بیٹے اس انداز سے انگلستان سے نہیں واپس آتے تھے۔ انھیں تو مرعوب کن سوٹ میں ملبوس ہونا چاہیئے تھا۔ ٹرین سے بھی انھیں ایک 'انگلینڈ ریٹرنڈ' کی شان سے اترنا تھا۔ بات کرتے وقت بھی خیال رکھنا تھا کہ بن بن کر بولا جائے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ کمپارٹمنٹ سے اپنا سامان بھی خود ہی اُتار رہے تھے! کچھ دوستوں کو تو واقعی بہت زیادہ مایوسی ہوئی۔

بلراج کے چہرے پر زردی کی جھلک تھی۔ وہ کچھ دبلے اور کمزور بھی معلوم ہو رہے تھے۔ بال بھی چھدرے ہو رہے تھے اور کنپٹیوں کے پاس سفید ہو چلے تھے۔ جسم بھی جیسے کچھ سوکھ سا گیا تھا۔ پہلے ان کا رنگ ہمیشہ سرخ و سفید رہا تھا۔ چار برس پہلے جب وہ انگلستان کے لیے روانہ ہوئے تھے تو محمد اسماعیل کی دکان کے سلے ہوئے نئے سوٹوں سے ان کے صندوق بھرے ہوئے تھے۔ اب انھیں زردی مائل ہرے نیکر، موٹے سوتی کپڑے کی قمیص اور چپّل پہنے دیکھ کر ہمارا حیران اور پریشان ہونا فطری تھا۔ دمینتی بھی معمولی شلوار قمیص میں ملبوس تھیں۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ موٹی ہو گئی تھیں۔ اُن کے گھنے سیاہ بال سر پر جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور چڑیا کے گھونسلے جیسے لگ رہے تھے۔ ننھی شبنم کو وہ اپنے بازوؤں میں سنبھالے ہوئے تھیں۔

ماتا جی پہیّہ دار کرسی پر بیٹھی تھیں۔ (جب بلراج سمندر پار گئے ہوئے تھے تو ایک حادثے میں ان کی کولہے کی ہڈّی ٹوٹ گئی تھی۔) ماتا جی کا ننھّا سا پوتا پریکشت ان کے پاس کھڑا تھا۔ سارے خاندان کے دوبارہ ملن کی یہ تصویر بالکل مکمّل تھی۔ بلراج کی واپسی کے بعد جلد ہی ایک بہت چھوٹا سا واقعہ ایسا رونما ہوا جس نے ان کے اندر رونما ہونے والی تبدیلی کے بارے میں سب کچھ ظاہر کر دیا۔ ان کی آمد پر رواج کے مطابق ہمارے ماں باپ نے ڈھیر سارے لڈّو تیار کرائے تھے۔ جب دوست اور عزیز بلراج کو انگلینڈ سے واپسی کی مبارک باد دینے کے لیے آتے تھے تو انھیں یہ لڈّو پیش کیے جاتے تھے۔ بلراج کے ایک پُرانے دوست خاصے انگریزیت زدہ تھے۔ انھوں نے بتاجی کے اصرار کے باوجود لڈّو کھانے سے انکار کر دیا۔ دلیل یہ پیش کی کہ ہندوستانی مٹھائیاں انھیں انھیں پسند نہیں۔ بے عیب انگریزی لہجے میں وہ بلراج سے بگ بین اور ٹاور آف لندن اور ویسٹ منسٹر ایبے کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جب بلراج نے بات چیت کا رُخ ہندوستان کی طرف پھیرا تو وہ بڑی تحقیر کے ساتھ 'کانگریس والوں' کا اور ان کے مظاہروں کا ذکر کرنے لگے۔

بلراج فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے نکل گئے۔ اپنے مغرب زدہ دوست سے انھوں نے مڑکر 'گڈ بائی' کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ یہ دوست اگرچہ خود کبھی انگلستان نہیں گئے تھے، مگر اس کے باوجود انھیں توقع یہی تھی کہ بلراج سے انھیں پہلے کی نسبت اب زیادہ ذہنی قربت حاصل رہے گی۔ بلراج کا کسی قدر 'غیر انگریزی' رویہ دیکھ کر انھیں بہت مایوسی ہوئی۔ بلراج بھی ان کی اس خطا کو کبھی معاف نہیں کر سکے کہ انھوں نے پتاجی کے اتنی محبت سے پیش کیے ہوئے لڈوؤں کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔

بلاشبہ بلراج بدل چکے تھے، اور اس مرتبہ تبدیلی یقیناً زیادہ انقلابی نوعیت کی تھی۔

اب کی بلراج کے بارے میں میرا تاثر یہی رہا تھا کہ وہ ایک آزاد رو، بے پروا، مہم پسند آدمی ہیں۔ ان کے ذہن کو کسی بھی طرح کی پابندیاں جکڑے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ اخلاق اور کردار کے ضابطوں کی پیروی اگر کرتے بھی ہیں تو ان ضابطوں کی خاطر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے اور اپنی سہولت کے پیش نظر کرتے ہیں۔ وہ من مانی کرنے اور اپنی بات دوسروں سے منوانے کے عادی ہیں۔ کوئی بات ایک بار ان کے دل میں سما جائے یا کوئی دھن ایک بار ان پر سوار ہو جائے تو وہ اس کام کو کر ہی گزریں گے، سوچ بچار کے لیے ایک لمحہ کو بھی نہ رکیں گے۔ عواقب کی انھیں ذرا سی بھی فکر نہ ہوگی۔ پچھتاوا انھیں کبھی چھو کے نہیں لگاتا، تشکیک انھیں کبھی عذاب میں مبتلا نہیں کرتے۔ نئے نئے کام کرنا انھیں اچھا لگتا ہے اور اس راہ میں انھیں اس بات کی فکر کبھی نہیں ہوتی کہ لوگ ان کے متعلق کیا سوچیں گے اور کیا کہیں گے۔ دوسروں کے لیے ان کے دل میں خلوص ہے، گرم جوشی ہے، محبت ہے، مگر اس کے ساتھ مزاج میں آزاد روی اور بے فکری بھی رچی ہوئی ہے۔ ملنے جلنے، محفلیں جمانے اور ہنسی مذاق کے رسیا ہیں۔ ایک سے ایک نئی گپ اور چٹکلے سنانے کو ہر دم تیار رہتے ہیں۔ زندگی میں لگے بندھے دستورِ عمل پر کاربند نہیں رہ سکتے۔ میز پر جم کر کام کرنے سے نفرت ہے ۔۔۔ بلراج کے بارے میں میرا تاثر ان کے انگلستان جانے سے پہلے یہی تھا۔ مجھے مختلف حالات میں ان کا طرزِ عمل اور ان کے تجربات اکثر یاد آتے تھے۔ کئی واقعات میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اور میں ایک برات کے ساتھ لالہ موسیٰ گئے۔ ان دنوں وہ کالج سے نکلے ہی تھے اور کاروبار میں پتاجی کا ہاتھ بٹانے لگے تھے۔ براتیوں کے ٹھہرنے کا انتظام ریلوے اسٹیشن کے پاس کچھ ریلوے کوارٹروں میں کیا گیا تھا۔ ایک شام کو بلراج اور میں ٹہلتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی طرف جا نکلے۔ وہاں ایک ویٹنگ روم میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے دور رشتے کے بھائی وہسکی کی بوتل سامنے رکھے بیٹھے ہیں۔ یہ چھپی ہوئی پناہ گاہ انھوں نے اس لیے چنی تھی کہ برات میں جو بڑے بزرگ لوگ شامل تھے، وہ

کٹر آریہ سماجی تھے اور انگور کی بیٹی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ بلراج اس زمانے میں خود بھی نہیں پیتے تھے۔ بلراج کو دیکھتے ہی ان دونوں نے ہوش اُڑ گئے، جیسے کوئی جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔ بلراج بڑے اطمینان سے میز کی طرف بڑھے، ان میں سے ایک کا گلاس اُٹھایا، دو ایک گھونٹ وہسکی پی، تاکہ ان دونوں کی گھبراہٹ اور جھجک دور ہو جائے، اور پھر دیر تک ساتھ نہ دے سکنے کے لیے معذرت چاہ کر وٹینگ روم سے نکل آئے۔ یہ بتانا شاید غیر ضروری ہے کہ باقی ساری شام میرے اور ان کے درمیان گرما گرم بحث میں گزری۔ موضوع یہی تھا کہ کیا ان دونوں رشتے کے بھائیوں کی گھبراہٹ اور جھجک رفع کرنے کے لیے بلراج کا خود وہسکی کو منھ لگانا ضروری تھا؟

ایک اور موقع پر انھوں نے بمبئی میں ایک آفت سے بچ کر بھاگ نکلنے کی روداد سنائی۔ یہ واقعہ بھی ان ہی دنوں کا ہے جب وہ بزنس سے وابستہ تھے۔ اپنے ایک کاروباری دورے پر وہ بمبئی پہنچے ہوئے تھے۔ ایک روز وہ سیر کے لیے جوہو کے ساحل پر چلے گئے۔ وہاں ایک نوجوان کسبی انھیں آنکھوں کے اشاروں اور مسکراہٹوں سے انھیں رجھانے لگی۔ ان کا اشتیاق اور تجسس جاگ اٹھا اور وہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ کسبی نے اپنا معاوضہ آٹھ آنے بتایا، جو انھوں نے فوراً ادا کر دیا۔ پھر وہ چلتے چلتے ساحل پر ایک الگ تھلگ سی جگہ پر پہنچ گئے۔ مگر جب وہ لمسی لذت سے انھیں روشناس کرانے کے لیے چوما چاٹی اور لپٹنے چمٹنے پر اُتر آئی تو وہ ایسے حواس باختہ ہوئے کہ اُٹھ کر فوراً بھاگ کھڑے ہوئے۔ لڑکی انھیں آوازیں ہی دیتی رہ گئی: 'اپنے پیسے تو واپس لے جاؤ' مگر وہ کہاں رُکنے والے تھے۔ انھوں نے تو ایک بار پیچھے مُڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

انگلینڈ روانہ ہونے سے پہلے بلراج کی شخصیت کا رنگ یہ تھا۔ مگر انگلینڈ سے واپسی میں نے انھیں بہت مختلف پایا۔ ان کا سارا لاأبالی پن، سارے قلندرانہ رنگ ڈھنگ ہوا ہو چکے تھے۔ آزادروی اور بے پروائی کی رمق بھی نہ تھی۔ مہم پسندی برائے مہم پسندی ان کے لیے سارے معانی کھو چکی تھی۔ سیاست کو ان کی نظر میں اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی تھی جتنی پہلے کبھی حاصل نہ تھی۔ وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ حسّاس، دردمند اور زود رنج ہو گئے تھے۔ بے تعلقی کی جگہ سروکار اور تعلقِ خاطر نے لے لی تھی۔ عادات و اطوار میں بھی نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ وہ اب پہلے سے زیادہ باعمل، چست اور مستعد ہو گئے تھے۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ انگلستان میں جو لکھنے لکھانے کا کام انھوں نے کیا تھا، اس کا ذکر بھی وہ کم ہی کرتے تھے۔ صرف رواروی میں دو ایک ریڈیائی ڈراموں کا ذکر ان کی زبان پر ضرور آیا جو انھوں نے وہاں لکھے اور نشر کیے تھے۔

راولپنڈی میں آنے کے بعد دوسرے دن ہی بلراج مجھ سے کہنے لگے کہ شام کو انھیں مسلم لیگ کے جلسے میں جانا ہے۔ (یہ جلسہ کمپنی باغ میں ہوا تھا اور اس سے فیروز خاں نون نے خطاب کیا تھا) میں یہ سنتے ہی ہھونچکارہ گیا تھا۔ اتنی دل چسپی سیاسی جلسوں میں انھوں نے پہلے تو کبھی دکھائی نہیں تھی، یہاں تک کہ کانگریس کے جلسوں میں بھی نہیں۔ ان کی بے تعلقی کا تو یہ عالم تھا کہ جب میں ان سے ملنے کے لیے سیواگرام گیا تھا تو انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ کانگریس کے آنے والے اجلاس میں، جو ہری پورہ میں ہونے والا تھا، مجھے ضرور جانا چاہیے۔ خود انھوں نے اس اجلاس میں شرکت نہیں کی تھی۔ البتہ میں پہنچ گیا تھا۔ خیر، اپنے کہنے کے مطابق، وہ اس شام کو مسلم لیگ کے جلسے میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد جلد ہی انھوں نے ضلع کانگریس کمیٹی کے زیر اہتمام ہونے والے ایک عوامی جلسے میں بھی شرکت کی۔ سارے ملک میں سیاسی جدوجہد ایک نئے موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ پاکستان کا مسئلہ سیاسی فضا پر چھانے لگا تھا، جس کا ایک نتیجہ فرقہ وارانہ کشیدگی کے روپ میں نکلا۔ جنگ کے خاتمے پر قوم پرور لیڈروں کو رہا کیا جا چکا تھا اور پورے ملک میں ایک بار پھر بے چینی اور بے اطمینانی کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ملکی سیاست کی ان ساری تبدیلیوں اور ہنگاموں سے بلراج کا لگاؤ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

پتا جی کے سوچ بچار کا رخ فطری طور پر اسی طرف ہو گیا تھا کہ بلراج اب کیا کریں گے، کون سے پیشے میں جائیں گے، کس سمت میں آگے بڑھیں گے۔ شکر ہے کہ اس مرتبہ انھوں نے 'بزنس' کا ذکر نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ بلراج اپنی دھن میں اتنی دور نکل گئے ہیں کہ کاروبار کے میدان میں ان واپسی محال ہے۔ شاید انھیں یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ جس 'بزنس' کی وہ پیش کش کرتے رہے ہیں وہ نہ تو زیادہ پُرکشش ہے اور نہ زیادہ منفعت بخش۔ اس کے ساتھ غالباً وہ یہ بھی سمجھ چکے تھے کہ بزنس کا خیال انھیں کسی اور سبب سے نہیں، اس آرزو کی وجہ سے آیا تھا کہ کاروبار ان کے بیٹے کو ان کے ساتھ ایک گھر میں رکھنے کا حیلہ بن جائے گا۔

دن گزرتے گئے اور بلراج کی طرف سے اس بات کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے کہ ان کا کیا کام کرنے کا ارادہ ہے۔ آنے کے چند روز بعد ہی آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے ایک انتظامی عہدے کی پُرکشش پیش کش ان کے سامنے آئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس بارے میں کسی اور کو کچھ پتہ چلتا یا گھر میں اس سلسلے میں کچھ بات چیت ہوتی، بلراج اس پیش کش کو نامنظور بھی کر چکے تھے۔ بعد میں پتا جی کو معلوم ہوا تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ ان کی رائے میں یہ فیصلہ دانش مندانہ نہ تھا۔ بی بی سی میں

چار سال کا نشریاتی تجربہ بجائے خود اعلیٰ اہلیت کی دلیل تھا۔ آل انڈیا ریڈیو میں کسی اچھے عہدے کے لیے یہ تجربہ اپنے آپ ایک پُرزور سفارش بن سکتا تھا۔ مگر بلراج کے خیالات کہیں اور تھے، اگرچہ اس باب میں ان کے ذہن میں کوئی واضح تصوّر نہ تھا کہ روزی روٹی کے لیے انھیں کیا کرنا ہے، کون سے پیشے میں جانا ہے۔ شاید وہ انتظار کر رہے تھے کہ کوئی خاص واقعہ رونما ہو تو وہ اس راہ پر پہلا قدم اُٹھائیں۔

راولپنڈی میں چند روز قیام کرنے کے بعد بلراج اور دمینتی اپنے دونوں بچّوں اور گھر کے کچھ افراد کے ساتھ سری نگر چلے گئے۔

گھر کی فضا ان دنوں لگ بھگ ویسی ہی ہو رہی تھی جیسی اس وقت تھی جب بلراج اپنی تعلیم مکمل کر کے کالج سے گھر واپس آئے تھے اور عملی زندگی کے میدان میں پہلا قدم رکھنے کی تیاری کر رہے تھے۔

اس مرتبہ بھی بلراج نے مستقبل کی طرف سری نگر میں ہی چھلانگ لگائی۔ ایک دن بلراج نے یکایک اعلان کر دیا کہ وہ بمبئی جا رہے ہیں۔ وہاں انھیں میکسم گورکی کے ڈرامے "پست تر گہرائیاں" پر مبنی ایک فلم میں اداکاری کرنا ہے۔ یہ فلم بلراج کے کالج کے زمانے کے پرانے دوست چیتن آنند بنانے والے تھے۔ پتاجی کے لیے یہ خبر انتہائی وحشت ناک تھی۔ انھوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا بیٹا، جس کی پرورش بہترین آریہ سماجی روایتوں کے ماحول میں ہوئی ہے، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، شادی شدہ اور دو بچّوں کا باپ ہے، بی بی سی جیسے باوقار ادارے میں کام کر چکا ہے، فلم ایکٹر کے رُسوائے زمانہ پیشے میں جا کر پھنسے گا ــــ اُس پیشے میں جسے سماج کے نچلے اور رذیل طبقے کے لوگ ہی اپناتے ہیں۔

اس فلم کے پروڈیوسر کا تعارف نامہ بھی اتنا مرعوب کن نہ تھا کہ پتاجی پر کچھ اثر پڑتا اور انھیں اس منصوبے کی کامیابی کا یقین ہو جاتا۔ تعارف کے طور پر بلراج پتاجی کو اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں بتا سکے تھے کہ چیتن آنند کالج میں ان کے ساتھی رہے تھے۔ وہاں وہ شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے انگلستان چلے گئے تھے، جہاں انھوں نے کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ ادھر کچھ مدّت پہلے تک وہ اسکول ٹیچر تھے، وغیرہ۔ ظاہر ہے، اہلیتوں کی تفصیل ایک باپ کو یہ باور کرانے میں کام یاب نہیں ہو سکتی تھی کہ بمبئی میں روشن امکانات کی پوری دنیا ان کے بیٹے کی آمد کی منتظر ہے۔ اس لیے اگر ایک مرتبہ پھر پتاجی کی راتیں بے خوابی کے عالم میں گزر رہی تھیں

تو یہ امر تعجب خیز ہرگز نہ تھا۔

اس دفعہ بھی بلراج ستمبر (1944) کے مہینے میں ہی سری نگر سے روانہ ہوئے۔ دمّو اور دونوں بچے'، پریکشت (عمر: پانچ سال) اور شبنم (عمر: سال بھر سے بھی کم) ان کے ساتھ تھے۔ لیکن اس بار بلراج تجربے اور مہم جوئی کی خاطر سفر نہیں کر رہے تھے۔ اس مرتبہ وہ بدلے ہوئے ذہن کے ساتھ نئے اُفق کی کھوج میں نکلے تھے۔

عالمی جنگ کے دوران میں جب بلراج لندن میں تھے تو انھوں نے ساری دنیا کو شعلوں کی لپیٹ میں جلتے، سلگتے دیکھا تھا۔ انھیں زندگی اور موت کی اس کش مکش کا قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس ہولناک صورتِ حال سے دوچار کرنے والے زبردست معاشی اور سیاسی عوامل بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہے تھے۔ نازی بربریت کے ہاتھوں قیدیوں کے کیمپوں میں لاکھوں یہودیوں کا خاتمہ، ہٹلر کی 'بلٹز کریگ'، یعنی لندن اور دوسرے یورپین شہروں پر اندھا دھند بمباری، ہٹلر کی آگے بڑھتی ہوئی طوفان صفت فوجوں کے خلاف سُرخ فوج کی سرفروشانہ مزاحمت، یورپ میں حکومتوں کا سقوط ــــ ان سب نے بلراج کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر زندگی کی عریاں اور سنگین حقیقتوں کا عرفان بخشا تھا۔ ان حقیقتوں سے فرار کا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ ان کی حد تک فن کارانہ بے نیازی کا رویّہ اختیار کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ بلراج نے اپنی آنکھوں سے پُرانی دنیا کو ملیامیٹ ہوتے اور ایک نئی دنیا کو ظہور میں آتے دیکھا تھا۔ دنیا اب پہلے کی طرح نہیں بن سکتی تھی، جہاں سلطنتیں اور سامراج اور نوآبادیاں تھیں۔ بلراج کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے اپنے وطن میں آزادی کے لیے جو جدوجہد ہو رہی ہے وہ عالمی پیمانے ہونے والی اس زیادہ بڑی جدوجہد کا ایک لازمی حصّہ ہے جس میں ایک طرف ترقّی کی طاقتیں ہیں، دوسری طرف رجعت کی طاقتیں۔

بلراج لندن کے دل میں رہ چکے تھے، جنگ کی پیدا کی ہوئی ہولناکیوں، دہشت گردیوں اور محرومیوں کو دیکھ بھی چکے تھے، کسی حد تک بھگت بھی چکے تھے۔ اس لیے انھیں یقین ہو گیا تھا کہ حقیقی فن کار زندگی کے ڈرامے کا محض خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ انھیں اپنے طور پر زندگی کے اس ڈرامے میں عملی حصّہ لینا ہے ـــ فن کار کے طور پر بھی اور شہری کی حیثیت سے بھی۔ فن اور فن کار کے منصب اور کارگزاری کے باب میں ان کے تصوّرات بھی بدل چکے تھے۔

فاشیت اور جمہوریت کے اس زبردست ٹکراؤ میں بلراج کی ہمدردیاں سوویت یونین اور

جمہوری طاقتوں کے ساتھ تھیں۔ اسی آویزش سے انھیں ان نظریات کے مضمرات کا سنجیدگی اور گہرائی سے مطالعہ کرنے کی ترغیب ملی جو اس عالم گیر کش مکش کے پسِ پشت کارفرما تھے۔ رفتہ رفتہ وہ سماجی مظاہر کی مارکسی تعبیر کی طرف بے اختیار مائل ہوتے گئے۔ لندن میں ان کے قیام نے انھیں پکا مارکس وادی بنا دیا تھا۔ اب بلراج نے چیتن آنند کی فلم میں کام کرنے کے لیے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ انھیں فلم ایکٹر کہلانے کا ارمان تھا یا وہ فلم کیریر اختیار کرنا چاہتے تھے یا پھر فلموں میں اداکاری کا شوق پورا کرنا چاہتے تھے۔ زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ وہ فن اور اظہار کے اس زبردست وسیلے کو آج کی زندگی کی حقیقتیں پیش کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے، تاکہ دیکھنے والوں کا سماجی شعور جاگے اور جوئے کم آب کی جگہ بحرِ بے کراں بنے۔

بلراج کے بمبئی جانے کے چند مہینے بعد پتاجی نے مجھے یہ دیکھنے کے لیے وہاں بھیجا کہ بلراج کس حال میں ہیں، ان کی فلم پیش رفت کے کس مرحلے پر ہے، اور انھیں اس منحوس پیشے کو چھوڑنے اور کوئی بہتر کام سوچ نکالنے پر اب بھی آمادہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس قسم کی مہم پر میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ جا چکا تھا، اس لیے پتاجی کی تجویز پر میں نے فوراً عمل کرنا منظور کر لیا۔

ریلوے اسٹیشن پر دمینتی مجھے لینے کے لیے آئیں۔ جب ہم پالی ہل (باندرہ) کی طرف بڑھ رہے تھے، جہاں ان کا قیام تھا، تو میں نے دمّو سے پوچھا کہ فلم کتنی بن چکی ہے۔ انھوں نے سوالیہ انداز سے مجھے دیکھا اور کہا: "فلم؟ کیسی فلم؟" اور پھر کچھ سمجھ کر وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں: "چل کر خود ہی دیکھ لینا"

بھابھی کے ساتھ میں پالی ہل پر ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر بنے ہوئے ایک کشادہ فلیٹ میں پہنچا۔ پتہ چلا کہ وہاں تو بہت سے لوگ آباد ہیں۔ ان میں چیتن آنند اور ان کی بیوی، حمید بٹ، ان کی بیگم اور دو سالیاں، بلراج اور ان کے خاندان کے علاوہ چیتن آنند کے دو بھائی گولڈی اور دیو آنند بھی شامل تھے۔ اس وقت سامنے کے بڑے، مشترکہ کمرے میں ریہرسل جیسا مشغلہ جاری تھا، جس میں فلیٹ کے سبھی مکین حصّہ لے رہے تھے۔ بہت جوش اور ولولے کی فضا تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ "نیچا نگر" (پست تر گہرائیاں" کے فلمی روپ) کے کسی سین کی نہیں، ایک ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی تھی، جو انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (اپٹا) کی طرف سے پیش کیا جانے والا تھا۔ چیتن آنند اس ڈرامے میں مرکزی رول ادا کر رہے تھے۔ بلراج ڈائرکٹر تھے۔ اس وقت خواجہ احمد عبّاس کی اس پیش کش "زبیدہ" کی آخری بار نوک پلک سنواری جا رہی تھی۔

مجھے یہ معلوم ہونے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی کہ سرمائے کی دشواریوں کے باعث فی الحال فلم "نیچانگر" کا منصوبہ ملتوی کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک زیادہ اہم کام ہاتھ میں لے لیا گیا ہے۔ یہ زیادہ اہم کام انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (جو اپٹا کے نام سے مشہور تھی) کی سرگرمیاں تھیں اور بلراج ان ہی میں اس قدر منہمک تھے کہ انھیں اپنا بھی ہوش نہ تھا۔

یہ انکشاف بھی مجھ پر جلد ہی ہو گیا کہ اپٹا محض ایک ڈرامے پیش کرنے والی تنظیم نہ تھی، بلکہ اس کی نوعیت ایک تحریک جیسی تھی۔ اس کی ایک یادگار پیش کش میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا جس کا موضوع بنگال کا کال تھا۔ اس سلسلے میں اپٹا کی ایک ناچنے گانے والی منڈلی نے پورے شمالی ہندوستان کا دورہ کیا تھا اور قحطِ بنگال کا شکار ہونے والوں کے لیے چندہ جمع کیا تھا۔ یہ ماجرا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ آفت رسیدہ لوگوں کا نظارہ دیکھ کر عورتیں اس قدر متاثر ہوئی تھیں کہ بے اختیار ہو کر انھوں نے اپنی سونے کی چوڑیاں کلائیوں سے اُتار کر بنگال کے مصیبت زدہ عوام کی امداد کے لیے دے دی تھیں۔ بلاشبہ اپٹا کو ہمارے ملک کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں بہت زبردست اور اہم رول ادا کرنا تھا۔ اس نے عوام کی زندگی سے اپنا رشتہ بہت قریبی رکھا، ناچ، گانے اور ناٹک کے لوک روپ سے کافی استفادہ کیا، اور جلد ہی سماجی ڈرامے کے احیا اور فروغ کے لیے ایک طاقت ور مرکز بن گئی۔

جب میں فلیٹ میں پہنچا تو اس مسئلے پر زور دار بحث جاری تھی کہ اسٹیج پر ایک گھوڑے کو کیسے لایا جا سکتا ہے۔ پتہ چلا کہ ڈرامے میں ایک شادی کا سین تھا۔ برات کو (ہیروئن) زبیدہ کے گھر آنا تھا۔ بلراج کی دلی خواہش تھی کہ برات بالکل اصلی معلوم ہو۔ دولہا گھوڑے پر سوار آئے۔ آگے آگے بینڈ باجہ ہو۔ دولہا، دلہن کے رشتہ دار باقاعدہ 'ملنی' کی رسم میں شریک ہوں۔

"میں پھر کہتا ہوں، یہ غضب کا منظر ہوگا!" بلراج بار بار کہہ رہے تھے۔ یہ خیال ان ہی کے ذہن کی اُپج تھا اور وہ اسے عملی جامہ پہنانے پر تلے ہوئے تھے۔

"مگر اسٹیج پر گھوڑا آئے گا کیسے؟ کچھ عقل کی بات کرو، بلراج!" چیتن بولے۔

"کیوں نہیں آ سکتا؟ ذرا تصور تو کرو: سفید گھوڑا۔ خوب صورت زین۔ زرکار کپڑا پیٹھ پر پڑا ہوا۔ میں کہتا ہوں، یہ منظر سنسنی پھیلا دے گا۔"

"اور اگر گھوڑا اسٹیج پر بھڑک اُٹھا تو؟" چیتن نے اعتراض کیا۔

" یا کوئی اس سے بھی زیادہ بُری حرکت کر بیٹھا تو ؟ " حمید بٹ نے چوٹ کی
" اگر تم اسٹیج پر اسے لانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو وہ تماشائیوں کا دھیان بٹانے کا سبب بن جائے گا۔ لوگ تمھارے مکالمے سننے کی جگہ گھوڑے کو ہی دیکھتے رہیں گے۔"
مگر بلراج اپنی ہٹ پوری کر کے ہی رہے۔ ہاں، اتنا ضرور ہوا کہ گھوڑا اسٹیج پر نہیں آیا۔ برات دھوم دھام سے ہال میں داخل ہوئی (ڈراما سندر بائی ہال میں اسٹیج کیا گیا تھا)۔ آگے آگے بینڈ باجے کا شور تھا۔ سب سے پیچھے دولہا ایک سفید گھوڑی پر سوار تھا۔ اس کے سر پر چھتر تھا۔ غرض سارا تام جھام تھا۔ دشواری سے بچنے کے لیے دولہا گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے ہال میں داخل نہیں ہوا، بلکہ ہال کے دروازے پر ہی رک گیا۔ سب تماشائی اُسے وہاں دیکھ سکتے تھے۔ پھر جب وہ 'ملنی' کی رسم پوری ہو گئی تو وہ گھوڑی سے اتر کر ہال کے اندر آگیا۔ 'ملنی' کی رسم ہال کے اندر ہی اسٹیج کے ٹھیک سامنے ہوئی۔ شادی کے اس سین میں جدت بھی تھی، حقیقی رنگ بھی تھا، شان دار تماشے جیسی ولولہ خیز فضا بھی تھی۔ ویسے بھی تماشائیوں نے ' زبیدہ کی پُرجوش پذیرائی کی۔ اس کے مکالمے چُست، برجستہ اور شگفتہ تھے۔ اس کی زبان وہی تھی جو سماج کے اس طبقے میں حقیقتاً بولی جاتی ہے جس کے بارے میں یہ ڈراما لکھا گیا تھا۔ اس کے موضوع کا تعلق ایک عصری صورتِ حال سے تھا اور اس میں سماجی مقصدیت کا احساس رچا ہوا تھا۔ ڈرامے کی ساخت میں کچھ کمزوریاں ضرور رہ گئی تھیں، مگر پھر بھی یہ بہت کامیاب رہا اور سماجی وابستگی سے بھرپور ان ڈراموں کا پیش رو بن گیا جو برسوں بعد تک اپٹا کے اسٹیج پر پیش کیے جاتے رہے۔ یہ ڈراما خواجہ احمد عبّاس کے ساتھ بلراج کے طویل دورِ رفاقت کا آغاز بھی ثابت ہوا۔ دونوں کا مسلک ایک تھا۔ عبّاس اپٹا کے بانی رکن تھے اور سماجی وابستگی کے گہرے احساس سے سرشار تھے۔ بعد میں دونوں نے مل کر کئی اسٹیج ڈراموں، فلموں اور سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ایک ساتھ کام کیا۔ ان میں غالباً سب سے زیادہ اہم اور عظیم الشان کاوش " دھرتی کے لال " تھی۔ یہ فلم 1940 کی دہائی کے شروع میں رونما ہونے والے بنگال کے کال پر مبنی تھی۔ اس میں بلراج اداکار کے طور پر شامل تھے۔ اسکرپٹ اور ڈائریکشن کی ذمہ داری عبّاس نے سنبھالی تھی۔
فن کار کی حیثیت سے بلراج کی نشو و نما کرنے میں اپٹا کی اپنی الگ دین رہی۔ اس سے پہلے بلراج جس حقیقت پسندانہ اسٹیج سے وابستہ رہے تھے وہ شستہ اور نستعلیق قسم کا تھا۔ وہاں اظہار میں ضبط، ٹھہراؤ اور نفاست پر زور دیا جاتا تھا۔ لوک ناٹک جیسی بے روک ٹوک بے باکی، آزادی، بے تکلف آمد کی کیفیت اور بے محابا جوش وہاں ناپید تھا۔ اپٹا ایک ایسی تحریک تھی جو فن کے

عوامی اسلوبوں سے دل کھول کر استفادہ کرتی تھی۔ پھر اس کے تماشائی بھی چیدہ شہری طبقے کے لوگوں پر نہیں، عام آدمیوں کے ہجوم پر مشتمل ہوتے تھے۔ حقیقت پسندی اور لوک ناٹک کے زور و قوت کے اس سنگم سے بلراج کو اداکاری میں اپنے خاص کردار کی تشکیل اور استحکام میں بہت مدد ملی۔ اپنے فن کو جان دار جذباتی رنگ سے سجانا بھی انھوں نے وہیں سے سیکھا۔ تاہم اس دور کو ان کی زندگی میں کافی بعد میں آنا تھا۔ ابھی تو محض شروعات ہو رہی تھی۔

اس شروعات اور روشناسی کے مرحلے کو خود بلراج نے اس طرح بیان کیا تھا :

ایک صبح میں نے اخبار میں پڑھا کہ پیپلز تھیٹر کی طرف سے ایک ڈراما کہیں پیش کیا جا رہا ہے۔ میں چین کے پیپلز تھیٹر کے بارے میں تو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ سوچنے لگا کہ یہ ہندوستان کا پیپلز تھیٹر کہاں سے آٹپکا۔ شام کو، دن بھر بہت سے زینوں پر چڑھنے اُترنے کے بعد میں بی۔ پی۔ سامنت اینڈ کمپنی کے دفتر میں جا گھسا۔ وہاں مشہور فلم جرنلسٹ بی۔ پی۔ ساٹھے موجود تھے۔ میں ان سے پوچھا: "ساٹھے صاحب' کیا بمبئی میں کوئی پیپلز تھیٹر بھی ہے ؟"

"کیوں نہیں ؟" وہ ہنس پڑے۔ "میں خود بھی اس کا ممبر ہوں اور اس کی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے جانے والا ہوں۔ چاہو تو میرے ساتھ تم بھی چلے چلو۔ آج خواجہ احمد عبّاس اپنا نیا ڈراما سنائیں گے۔"

میرے کہنے پر چیتن آنند بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔

اوپیرا ہاؤس کے پاس ایک تنگ سی گلی میں پروفیسر دیودھر کا میوزک اسکول تھا۔ اسکول میں ایک چھوٹا سا ہال بھی تھا، جہاں لگ بھگ سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ایک طرف کو چھوٹا سا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ یہی ہال اِپٹا کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جب ہم پہنچے تو ہال میں تقریبًا بیس لڑکے، لڑکیاں براجمان تھے۔ عبّاس اپنا ڈراما سنانے ہی والے تھے۔ عبّاس کی اور میری تھوڑی بہت جان پہچان پہلے سے ہی تھی۔ جب میں لندن میں تھا تو میں نے ان کی کچھ کہانیاں بھی پڑھی تھیں۔ لیکن یہ جان پہچان غائبانہ ہی تھی۔ ملاقات کا موقع اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ عبّاس نے بیٹھے بیٹھے ہی مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنا ڈراما پڑھ کر سنانے لگے۔ ظاہر ہے، صرف ایک بار سُن کر کسی ڈرامے کی قدر و قیمت کو پرکھنا

بہت مشکل ہے۔ تاہم اس وقت مجھے یہی محسوس ہوا کہ عباس کے ڈرامے میں بھرپور جذباتی گہرائی یا ڈرامائی ارتقا نہیں ہے۔ ابھی میرے ذہن میں اس طرح کے خیالات اُبھرے ہی تھے کہ عباس نے یکایک ایک عجیب سا اعلان کر ڈالا۔ کہنے لگے: "دوستو، مجھے بے حد خوشی ہے کہ آج بلراج ساہنی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ میں اب اپنا ڈراما اس درخواست کے ساتھ ان کے حوالے کرتا ہوں کہ اس کی ڈائریکشن کا بار وہی سنبھالیں۔"

اس اچانک اعلان پر میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ میرے منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ لیکن اتنی ہوش مندی کا ثبوت ضرور میں نے دیا کہ انکار نہیں کیا۔ حالات کے جبر کے تحت جیسی بے عملی کے ساتھ میں وقت کاٹ رہا تھا، اس سے میں بُری طرح اکتا چکا تھا۔ یہ موقع سامنے آیا تو سوچا، اب کچھ کرنے کو کام تو میرے پاس ہوگا۔

اس طرح بالکل خلافِ توقع وہ دور شروع ہوگیا جس نے میری زندگی پر امٹ نقش چھوڑا ہے۔ میں آج بھی فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں اِپٹا کا آرٹسٹ ہوں۔ وہ ڈراما جس سے میرے اِس دور کا آغاز ہوا، "زبیدہ" تھا، جو 1944 کے موسم سرما میں بمبئی میں اسٹیج کیا گیا تھا۔

بلراج ان دنوں ایسے ہو رہے تھے جیسے کوئی اور روح ان کے اندر سما گئی ہو، ان پر چھا گئی ہو۔ انھیں اپنا ذرا سا بھی ہوش نہ تھا۔ اِپٹا اور اس کی سرگرمیوں کے سوا کوئی خیال انھیں آتا ہی نہ تھا۔ وہ بہت بدل گئے تھے۔ پہلے قومی جد و جہد سے ان کی وابستگی محض جذباتی حد تک رہی تھی، اب وہ تھیٹر آرٹسٹ کے طور پر اس میں عملاً شریک تھے۔ فن اور سیاست کے درمیان پہلے جو حد بندی انھوں نے کر رکھی تھی، اب یک سر غائب ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ فن کارانہ اور سیاسی، دونوں طرح کی سرگرمیوں کا گھُل مِل جانا ہی وقت کا تقاضا ہے۔ اِپٹا سماجی وابستگی کی حامی ڈرامائی تحریک تھی۔ اس کا منشا یہ تھا کہ سماجی حقیقت کی ہو بہو اور واضح تصویر پیش کی جائے، اور وہ بھی الگ تھلگ کھڑے ہوئے تماشائی کے زاویۂ نظر سے نہیں، زندگی کے ریلے میں نبرد آزما اور شریک شخص کے زاویۂ نظر سے۔ فن کی تخلیق ناجانب داری اور لاتعلقی کی فضا میں نہیں ہوتی۔ اس کے لیے گہرا اور گرم جوش لگاؤ اور وابستگی ضروری ہے۔ اسی لیے 1940 کی دہائی میں اپٹا ہندوستان میں تھیٹر کے فروغ کے معاملے میں اپنی بھرپور چھاپ چھوڑنے میں کامیاب رہی۔ ہم ایسے لوگ جو اپٹا کی سرگرمیوں میں کسی نہ کسی طور شریک رہ چکے ہیں یا کم از کم

اس کی کاوشوں کو دیکھ چکے ہیں، اپٹا کو ہمیشہ فخر اور فرحت کے ملے جلے احساس کے ساتھ یاد رکھیں گے۔
اس کی شاخیں ہر لسانی خطے میں پھل پھول رہی تھیں۔ بنگالی زبان میں یہ لوگ عصری موضوعات پر 'جاترا' اسٹیج کرتے تھے، یا پھر پرچھائیں کے کھیل یا ایسے ڈرامے پیش کرتے تھے جو بنگالی تھیٹر کی بہترین روایتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتے تھے۔ بہت سی ریاستوں میں ناچنے، گانے والوں کی منڈلیاں برسرِ عمل تھیں۔ مہاراشٹر کی شاخ 'اگاڑا' اسٹیج کرتی تھی تو یو۔پی کے فن کار 'نوٹنکی' دکھاتے تھے۔ یہ تحریک ناٹک کی عوامی شکلوں کو بھی دوبارہ زندہ کر رہی تھی اور نئے نئے روپ بھی ایجاد کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ مغربی ڈرامے بھی ہندی اور دوسری زبانوں میں منتقل کر کے اسٹیج کیے جاتے تھے، مثلاً گوگول کا "انسپکٹر جنرل" جے۔بی۔ پریسٹلی کا " THEY CAME TO A CITY "
"وہ ایک شہر میں پہنچے" اور "انسپکٹر کالس" اور دوسرے کئی ڈرامے۔ اپٹا اس اعتبار سے بے مثال تحریک تھی کہ یہ فن کار کو سماجی حقیقت کے قریب کر دیتی تھی اور اس کے ساتھ اسے ترقی پسند قوتوں کی صفوں میں شامل ہو کر جد و جہد میں شریک ہونے کا ولولہ بھی بخشتی تھی۔ یہ اسی کا فیض تھا کہ اسٹیج کی سرگرمیاں اب صرف جدید طبقے یا پیشہ ور تھیٹر تک محدود نہیں رہی تھیں۔ اپٹا کے اسٹیج نے بلراج کو سماجی حقیقت سے وابستگی اور عوامی جد و جہد میں شرکت کا وہ احساس عطا کیا جس سے وہ پہلے محروم ہی رہے تھے۔ پھر یہ امر تعجب خیز کیوں ہو کہ اپٹا کی سرگرمیوں میں وہ ایسے مگن رہنے لگے تھے جیسے مچھلی پانی میں۔

اب یہ کہنا تو شاید غیر ضروری ہی ہے کہ اپنے بھائی کو سمجھانے بجھانے اور انھیں گھر لوٹنے پر آمادہ کرنے کی جگہ میں خود ان کے مسلک پر ایمان لے آیا تھا۔ چنانچہ جب میں راولپنڈی پہنچا تو اس طرح کہ 'زبیدہ' کا اسکرپٹ میری جیب میں تھا۔

فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے جب بھڑکتے تھے تو اپٹا کی ٹولیاں بے جگری کے ساتھ ایسے علاقوں میں قومی یگانگت پر اپنے شو دکھانے کے لیے پہنچ جاتی تھیں جہاں فرقہ وارانہ کشیدگی کا دور دورہ ہوتا تھا۔ برِصغیر کی تقسیم کے وقت اور تقسیم کے بعد خون آشام دور میں عبّاس کا "میں کون ہوں؟" اور اس طرح کے دوسرے ڈرامے درجنوں بار اسٹیج کیے گئے۔ کبھی کبھی تو بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہ جسارت کی گئی۔ گانے والی ٹولیاں ہنگامی موضوعات پر گیت گاتی پھرتی تھیں۔ ان گیتوں کو لکھنے اور ان کی دھنیں بنانے والے پریم دھون، شنکر شیلندر، امر شیخ، انا بھاؤ ساٹھے، گاؤنکر اور ان جیسے دوسرے ارباب کمال تھے۔ اپٹا کی سرگرمیوں کا ایک دلچسپ پہلو اور بھی تھا۔ گرانٹ روڈ کے علاقے میں دیودھر ہال

میں ریہرسل کرنے کے بعد اپٹا کے جوشیلے فن کار جب مختلف علاقوں میں اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کے لیے مضافاتی ٹرین میں سوار ہوتے تو ڈبوں کے اندر بھی کورس میں ان گیتوں کو گانے لگتے۔ اکثر ان کے گرد مسافروں کی بھیڑ جمع ہو جاتی اور ذرا سی دیر میں سارا ڈبا حب الوطنی اور ترقی پسندی سے معمور ان گیتوں سے گونجنے لگتا۔

ایسی تھیں وہ سرگرمیاں جنھوں نے بلراج کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور جن کی وجہ سے بلراج عملاً اپٹا کے ایک کل وقتی فن کار اور کارپرداز بن کر رہ گئے تھے۔ چیتن کا گروپ یقیناً منتشر ہو چکا تھا۔ کچھ عرصے بعد بلراج اور دمینتی نے باندرہ والا فلیٹ چھوڑ دیا اور جوہو کی تھیوسوفیکل کالونی میں ایک چھوٹا سا بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ کنبے کی کفالت کا بار اب دمینتی نے سنبھال لیا۔ وہ اسٹیج اور فلموں میں اداکاری کرنے لگیں۔ اپٹا کی گرم جوش شیدائی وہ بھی تھیں۔ فن کار بھی بہت اچھی تھیں اور مارکس وادی نظریات پر تو وہ بلراج سے بھی پہلے ایمان لا چکی تھیں۔ وہ بمبئی کے پرتھوی تھیٹر میں شامل ہو گئیں۔ ماہانہ تنخواہ چار سو روپے تھی۔ ہندوستانی پردۂ فلم کے مشہور اداکار پرتھوی راج نے ان دنوں نیم پیشہ ورانہ بنیاد پر یہ تھیٹر قائم کر رکھا تھا۔ اس کی طرف سے اوپیرا ہاؤس میں ترقی پسندانہ قومی نظریات پر بہت پُر اثر ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔ جن فن کاروں کو انھوں نے اپنی ٹیم میں شامل کیا، ان میں سے ایک دمینتی بھی تھیں۔ کچھ ڈراموں (خاص طور سے "دیوار") میں ان کی اداکاری کا کمال تماشائیوں کی یادوں میں بہت مدت تک بسا رہا ہوگا۔ اپٹا کی مشہور فلم "دھرتی کے لال" میں بھی انھوں نے کام کیا تھا۔ اس کے علاوہ "ہلچل" "دور چلیں" "گڑیا" وغیرہ کتنی ہی فلموں میں انھیں رول دیے گئے۔ فلموں میں ان کے قدم خاصے جم چکے تھے اور مستقبل کے امکانات ان کے لیے اور بھی روشن نظر آ رہے تھے۔

یہ سرگرمیاں ان سپنوں اور اُمیدوں سے کوسوں دور تھیں جو پتا جی نے بلراج سے ان کی انگلستان سے واپسی پر کر رکھی تھیں۔ پتا جی کا ذہن بھلا ایسی باتوں کو کس طرح قبول کر سکتا تھا کہ بلراج وہ پیشہ اختیار کریں جو سرے سے پیشہ تھا ہی نہیں۔ کنبے کی کفالت کے لیے بیوی گھر سے نکلے اور مزید ستم یہ ہو کر اسے ڈراموں اور فلموں میں کام کر کے پیسہ کمانا پڑے۔ ان باتوں سے ان کی عزت کو ٹھیس پہنچتی تھی، خوب اور ناخوب کے سلسلے میں جو معیار ان کے ذہن میں راسخ تھے وہ زد میں آتے تھے، روح کی گہرائی میں رچے ہوئے اخلاقی عقیدے مجروح ہوتے تھے۔ اور اسی لیے ایک سہانی صبح کو وہ بمبئی میں وارد ہو گئے، تاکہ حالات کا خود اپنی آنکھوں سے جائزہ لے سکیں۔

ان دنوں اِپٹا کی مرکزی منڈلی نے اندھیری میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا، جس کے باہر بہت کشادہ احاطہ تھا۔ اس احاطے میں برگد کے ایک بڑے سے درخت کی چھاؤں میں مٹی کا چبوترا بنا ہوا تھا۔ یہ چبوترا ریہرسل وغیرہ کے لیے اسٹیج کا کام دیتا تھا۔ کبھی کبھی ڈراموں کے پرائیویٹ شو بھی یہیں پیش کیے جاتے تھے۔

ایسا ہی ایک پرائیویٹ شو پتاجی کے بمبئی پہنچنے کے بعد ہوا۔ سنگیت کی اس محفل میں ناچ، گانے اور چند نقلیں پیش کی گئیں۔ بینوئے رائے کی رہ نمائی میں اِپٹا کی ثقافتی منڈلی نے اس کا اہتمام کیا تھا۔ بلراج اس شو میں پتاجی کو بھی لے گئے اور شو ختم ہونے کے بعد تک ان کے پاس ہی بیٹھے رہے۔ پتاجی بہت ذوق وشوق اور تجسس کے عالم میں گانے سنتے رہے، ناچ اور اداکاری کا کمال دیکھتے رہے۔ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ان کی دل چسپی بڑھتی ہی گئی۔ سرفروشانہ جدوجہد اور قربانی کے جذبے سے لب ریز وطن پرستی کے نغموں نے پتاجی کے دل پر ایسا اثر کیا کہ شو ختم ہونے پر انھوں نے بے اختیار ہوکر بلراج کو سینے سے لگالیا اور کہنے لگے: "اگر تم یہاں یہی سب کچھ کررہے ہو تو پھر مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

29 / اپریل 1947 کو دمینتی یکایک وہاں چلی گئیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ چند مہینے پہلے جب دیہی علاقوں میں "دھرتی کے لال" کی شوٹنگ چل رہی تھی تو دمینتی امیبائی پیچش میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ اس روگ کا سرچشمہ غالباً وہ تالاب تھا جس کا پانی وہ اور یونٹ کے دوسرے لوگ پیتے رہے تھے۔ پھر ایک بے پروا ڈاکٹر نے انجکشن کے ذریعہ امیبائن کی ضرورت سے زیادہ مقدار ان کے جسم کے اندر پہنچادی۔ کچھ تو یہ بے پروائی رنگ لائی، کچھ بہت زیادہ جسمانی محنت اور بھاگ دوڑ نے اپنا اثر دکھایا، اور نتیجے میں دمّو اچانک ایسی گریں کہ پھر کبھی نہ اُٹھ سکیں۔

اس سانحے نے بلراج کے سارے وجود کو تہہ وبالا کرکے رکھ دیا۔ بھری جوانی میں (28 برس کی عمر میں) دمّو کا گزر جانا ایسا ہی تھا جیسے بلراج کی زندگی کا مرکز ومحور کہیں کھو گیا ہو۔ دمّو بہت محبّت پاش بیوی اور روشن خیال جیون ساتھی تھیں۔ گزشتہ تین برس سے دونوں یکساں جوش وخروش کے ساتھ، ایک جیسے بے غرض اور بے لوث انداز سے، ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ اِن سرگرمیوں میں شریک رہے تھے جو نہ صرف انھیں قریب تر لانے کا حیلہ بنی تھیں بلکہ ان کی ازدواجی زندگی کو زیادہ بھرپور، زیادہ جاں فزا، زیادہ خوش وخرّم بنانے کا ذریعہ بھی ثابت ہوئی تھیں۔

بلراج نے یک بیک اپنے آپ کو ایک خلا میں بھٹکتے ہوئے پایا۔ لیکن اپنی محرومی کو انھوں

نے بہت ہمّت اور حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔ اس مرحلے پر اُس نصب العین سے بے پناہ لگاؤ نے ان کو بہت سہارا دیا جس کے لیے انھوں نے جی جان سے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ وہ اکثر رات کو بستر سے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ بے قراری کے عالم میں سمندر کے کنارے جا نکلتے، وطن پرستی کے گیت گاتے، اور اس طرح جینے کی اُمنگ اور حوصلہ اور قوّت حاصل کرنے کے جتن کرتے۔

اگست 1947 میں آزادی کی صبح نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی برِّ صغیر کے بٹوارے کی گھڑی بھی آئی۔ طرح طرح کی کشیدگیوں کا غبار فضا میں ہر طرف رچ گیا۔ فرقہ وارانہ نفرت نے سارے برِّ صغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کتنے ہی شہر، کتنے ہی دیہات شعلوں میں گھر گئے۔ بے اندازہ تباہی اور خوں ریزی اس جنون کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کے ساتھ عوام کے دلوں میں خوشی کا احساس بھی تھا۔ آخر غلامی کے اتنے طویل دور کے بعد انجام کار ملک آزاد ہو ہی گیا تھا۔ خود ہمارے راولپنڈی کے ضلع میں بھیانک فسادات کی باڑھ آئی ہوئی تھی۔ وہاں دو سو سے زیادہ گاؤں جلا کر خاک کر دیے گئے تھے۔ جشن، فکریں، اندیشے ـــــ سب کا ایک ساتھ ہی دور دورہ تھا۔ پاکستان سے شرنارتھی ہجوم در ہجوم آرہے تھے۔ بٹوارے کے دنوں میں بلراج بمبئی میں تھے، ان کے دو بچّے ہماری ماتا جی کے ساتھ سری نگر میں اور پتا جی اکیلے راولپنڈی میں۔ مزید آفت یہ تھی کہ سارا مواصلاتی نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ کسی کی خیر خبر تک کا ملنا دشوار ہو گیا تھا۔ سفر کے ذرائع بھی ٹھپ پڑے تھے۔ پھر جلد ہی پاکستان کی طرف سے قبائلی کشمیر پر حملہ آور ہو گئے۔ اس سے معاملات اور بھی پیچیدہ ہو گئے۔ فکریں اور بھی بڑھ گئیں۔ ایک طرف دمینتی چل بسیں، دوسرے طرف بٹوارے کی وجہ سے ہونے والے نقصان کے ہاتھوں پتا جی کی مالی طور پر کمر ٹوٹ گئی۔ ان حادثوں نے بلراج کے مالی حالات کو بھی کافی حد تک بدل کر رکھ دیا۔

اب بلراج کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ آنے والے چند برسوں میں ایک طوفانی جد و جہد نے ان کے عزم و ہمّت کا امتحان لیا۔ ایسی بے پناہ اور اتنی صبر آزما جد و جہد انھیں اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں کرنا پڑی تھی۔

6

فلمی دنیا میں

بلراج 1944 میں بمبئی پہنچے تھے۔ وہاں آکر جلد ہی انھیں پتہ چل گیا کہ مالی دشواریوں کے باعث چیتن آنند کی فلم اگر بنی بھی تو بہت تاخیر سے بنے گی۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ اس کا بننا غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہو جائے گا یا سرے سے اس منصوبے کو سرد خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ سرمائے کی فراہمی کے لیے چیتن جان توڑ کوششیں کر رہے تھے، لیکن انھیں ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو ان کے قابو سے باہر تھیں اور یہ بیل کسی طرح منڈھے نہیں چڑھ رہی تھی۔ ان حالات میں بلراج نے یکایک ایک اجنبی، نامانوس شہر میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا اور بے آسرا پایا۔ اب گزر بسر کے لیے انھیں خود ہی کمانا تھا، خود ہی جتن کرنے تھے۔ فلم ایکٹر بننے کے سپنے دیکھنا سہل تھا، مگر انڈسٹری میں قدم جمانے کی جگہ حاصل کر لینا ذرا مختلف معاملہ تھا۔ مالی طور پر بھی بلراج کی حالت پتلی ہو چلی تھی۔ بی بی سی کی ملازمت کے دنوں میں جو کچھ انھوں نے پس انداز کیا تھا اسے وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ لیکن رقم بہت بڑی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ روپے کے لیے انھیں پتاجی کے آگے ہاتھ پھیلانا بھی منظور نہ تھا۔ یہ احساس انھیں پہلے ہی کچو کے دے رہا تھا کہ اس طرح نہایت بے پروائی کے ساتھ بمبئی آکر وہ پتاجی کا دل دکھا چکے ہیں۔ پھر اس تنگی میں ان کے ساتھ بچے بھی تھے۔ شبنم مشکل سے سال بھر کی ہوگی۔ پریکشت پانچ برس کا ہوا ہی تھا۔ چیتن کے اپنے ذرائع بھی محدود تھے، مگر اس کے باوجود انھوں نے اس تنگی کے دور میں سچے دوست کی طرح بلراج کا ساتھ دیا۔ انھوں نے اپنے کئی جان پہچان والوں سے بلراج کو متعارف کرایا لیکن بڑی حد تک بلراج کو اس کڑی آزمائش کا سامنا اکیلے ہی کرنا پڑا، اور یوں ان کے لیے جدوجہد کے صبر آزما دور کی شروعات ہو گئی۔

بلراج اپنے فلمی کیریر کا آغاز اس عالم میں کر رہے تھے جب کئی بڑی کوتاہیاں، کئی بڑی رکاوٹیں ان کی دامن گیر تھیں۔ سب سے زیادہ ناموافق پہلو تو یہی تھا کہ ان کی عمر 34 برس ہو چکی تھی۔ اس عمر میں وہ نوجوان، کھلنڈرے ہیرو کے رول کے لیے منتخب کیے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے

تھے۔ اُدھر بمبئی میں قیام کے دوران میں ان کی صحت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ وہ کُٹتے ٹُٹتے، ڈھیلے ڈھالے اور اُجڑے اُجڑے نظر آتے تھے۔ مالی تنگی نے حلیہ اور بھی بگاڑ دیا تھا اور (خود بلراج کے الفاظ میں) "بمبئی کی سرزمین ایسوں کو راس نہیں آتی جو فلموں میں آنے کے آرزومند ہوں، مگر ذرائع بہت محدود ہوں۔"

" انگلینڈ سے جو تھوڑی بہت رقم لے کر آیا تھا وہ بھی ساتھ چھوڑ چلی تھی۔ اور پتاجی سے روپیہ منگوانے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا" فلمی دنیا میں اپنے ابتدائی دور کی یاد تازہ کرتے ہوئے انھوں نے برسوں بعد اپنے ایک خط میں لکھا:

میری صحت کے زوال کی وجہ مالی پریشانی اور بے قاعدہ زندگی تھی۔ تھوڑی سی رقم کمانے کے لیے بھی مجھے ان دنوں بہت پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ کیا کیا نہ کیا میں نے اس زمانے میں! ٹریڈرس بینک کی ایک شاخ کا منیجر کبھی میرا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ اس سے مجھے بہت سہارا ملا۔ ضرورت پڑنے پر وہ مجھے بینک سے چھوٹا موٹا قرض آسانی سے دلا دیتا تھا۔ پھر ایک وقت وہ آیا جب بینک کا قرض دو ہزار روپے ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی یکایک ایک روز میرے اس دوست کے لیے تبادلے کا حکم آ گیا۔ ایک مہینے کے اندر اسے روانہ ہو جانا تھا اور یہ میرا اخلاقی فرض تھا کہ اس کی روانگی سے پہلے میں بینک کے قرض کی ادائیگی کر دوں۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے میں نے جو جتن کیے وہ ایسے ہی تھے جیسے کوئی اپنے ناخنوں سے کنواں کھودنے کی کوشش کرے۔ میرے بس میں اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کچھ ریڈیو پروگرام یا ترجمے کا کام کر ڈالوں۔ مگر اس قسم کے کام سے میں کتنی رقم حاصل کرنے کی توقع کر سکتا تھا؟

اس تنگ دور میں بلراج کی ملاقات بھونانی سے ہوئی۔ بھونانی جب بہت پہلے ہمارے ساتھ کشمیر میں آ کر رہے تھے تو انھوں نے بلراج کو ایک رول کی پیش کش کی تھی۔ اب بمبئی میں بھونانی نے بلراج کو ڈنر پر بلایا، لیکن فلم وغیرہ کا ذکر ایک بار بھی نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا کہ بلراج کا چہرہ گیری کوپر کے چہرے سے ملتا جلتا ہے۔ بلراج اسے اپنی تعریف سمجھے، مگر بھونانی کا منشا صرف یہ جتانا تھا کہ بلراج اتنے زیادہ دُبلے پتلے ہیں کہ ہندوستانی فلموں کے ہیرو کے رول میں قطعی نہیں جچیں گے۔ ہندوستانی تماشائی تو پھولے پھولے گالوں اور گول مٹول چہرے والے ہیرو کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ بھونانی کی طرف سے بھی بلراج کو مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ سفارشی خطوں، وعدوں اور یقین دہانیوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ ان

دنوں فلم انڈسٹری میں باریابی بلراج کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف بن گئی تھی۔
" رول کی تلاش کا مطلب یہ تھا کہ پروڈیوسروں کے دفتروں اور اسٹوڈیوز کے زینوں پر اَن گنت مرتبہ چڑھتے، اُترتے رہو، اور پھر بھی کہیں سے کوئی فیصلہ کن جواب نہ ملے" ۔۔۔۔ بلراج نے برسوں بعد اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔

بلراج کی یہ حالت دیکھ کر چیتن نے مشہور پروڈیوسر، ڈائریکٹر فنی مجمدار کے کان میں یہ بات ڈالی کہ اپنی کسی فلم میں بلراج کو بھی موقع دیں۔ اس وقت فنی مجمدار " جسٹس " بنانے کی تیار کر رہے تھے۔ انھوں نے اس فلم کے لیے بلراج کی آزمائش کی۔

فلمی دنیا میں بلراج کا پہلا تجربہ بہت یادگار قسم کا تھا۔ انھیں اس میک اپ روم میں بھیج دیا گیا جہاں 'ایکسٹرا' اداکار اپنا میک اپ کرا رہے تھے۔ بلراج کے اپنے لفظوں میں :

مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں بہت سے لوگ اپنا میک اپ کرانے میں مشغول تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ 'ایکسٹرا' ہیں۔ اگر معلوم ہوتا بھی تو میرے لیے کوئی فرق نہ پڑتا، کیونکہ اس وقت تک میں جانتا ہی نہ تھا کہ 'ایکسٹرا' کیا ہوتا ہے ... میں جلد ہی ان میں گھل مل گیا اور ان کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔
وہ سب اپنے بہترین لباس میں آئے تھے، کیونکہ انھیں ایک ٹی پارٹی میں شامل ہونا تھا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ میں حال ہی میں انگلینڈ سے واپس آیا ہوں تو میرے لیے ان کا رویّہ اور بھی احترام آمیز ہو گیا۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وہ معمولی لوگ نہ تھے۔ مثلاً ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ شہر میں اس کی چار فرنیچر کی دکانیں تھیں اور اسٹوڈیوز کا رُخ وہ کبھی کبھی صرف دل بہلاوے کی خاطر کر لیتا تھا۔ ایک روز وہ خود بھی اپنی فلم بنانے کی سوچ رہا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ اپنی مجوزہ فلم میں وہ مجھے ویلن کا رول ضرور دے گا، کیونکہ اس کے خیال میں چہرے مہرے سے میں بالکل انگریزی فلموں کے ایک ویلن جیسا نظر آتا تھا۔
کسی نہ کسی دن خود فلم ساز بننے کا منصوبہ اس شخص کے ہی نہیں، وہاں بیٹھے ہوئے ہر شخص کے ذہن میں تھا۔ فلم کے لیے کہانی بھی ہر شخص کے پاس موجود تھی، جو اس کی اپنی کاوش کا نتیجہ تھی۔ ہر شخص مشہور ترین فلمی ستاروں سے اپنے قریبی اور دوستانہ تعلقات کا چرچا کر رہا تھا، جن میں سے کچھ اس کی مجوزہ فلم میں اداکاری

کرنے پر آمادگی بھی ظاہر کر چکے تھے۔ . . . ان میں ایک پٹھان بھی شامل تھا، جس کا نام اسلم تھا۔ اس کا لہجہ مدّھم تھا اور باتیں بناوٹ سے پاک۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ فنی دا کو بُرا بھلا کہنے پر اُتر آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ فنی دا نے اپنی ایک پہلے کی فلم میں اسے ایک چھوٹا سا رول دیا تھا اور ساتھ ہی وعدہ کیا کہ اگلی فلم میں وہ اسے ایک بڑا رول دیں گے۔ ان یقین دہانیوں کے بموجب موجودہ فلم میں اسے ہیرو کا رول ملنا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ فنی دا اپنے سارے وعدے بھول گئے۔ وہ پے بہ پے چکر لگاتا رہا۔ اور اب اسے یہاں اس کمرے میں 'ایکسٹرا' اداکاروں کے ساتھ ٹھونس دیا گیا ہے۔ یہ کہتے کہتے اسلم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اسی لمحہ مجھے احساس ہوا کہ خود مجھ سے بھی فنی دا نے یہ وعدہ کیا ہے!

اس روز کے احوال بیان کرتے ہوئے بلراج آگے لکھتے ہیں:

ریہرسل کے دوران میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جبڑے خشک چمڑے کی طرح اکڑ گئے ہیں اور کسی بھی طرح معمول کی نرمی اختیار کرنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ میری آواز بھی اتنی مدّھم نکل رہی تھی کہ مشکل سے ہی سنائی دے۔ میرا خیال تھا کہ فنی دا میری کارگزاری پر مایوسی کا اظہار کریں گے، مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ وہ چلائے: "بہت اچھا شاٹ! او۔کے" اس کے ساتھ ہی کچھ لوگوں نے تالیاں اور سیٹیاں بجائیں، کچھ نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے مبارک باد دی، کیونکہ فلموں میں یہ میرا پہلا 'کلوز اپ' تھا۔ فنی دا نے رس گلّے منگوائے (میرے حساب میں) اور حاضرین میں بانٹے۔ ہر شخص کی زبان پر میری اداکاری کی تعریف تھی۔ اور میں تھا کہ حیرت اور الجھن کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ تعریف جھوٹی ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ یہ سب لوگ جھوٹی تعریف کر کیوں رہے ہیں۔

دکھاوے، ظاہر داری اور نمود و نمائش کی اس دنیا کا یہ ایک ایسا راز ہے جو باہر کے لوگوں کی سمجھ میں رفتہ رفتہ ہی آتا ہے۔

بلاشبہ یہ تعریف سراسر جھوٹی تھی۔ مگر کیا کیا جائے، اسٹوڈیو کی دنیا میں کوئی بھی شخص کسی بھی شخص سے سچ نہیں بولتا۔ یہاں سب کا یہی وطیرہ ہے کہ

آدمی کے منہ پر اس کی تعریف کرو اور پیٹھ پیچھے اس کی برائی۔ باہر کے لوگ اسے
ایک ذلیل حرکت کہیں گے، مگر اندر کے لوگوں کی نظر میں یہ آگے بڑھنے کا ایک
کارگر نسخہ ہے۔ فلمی دنیا میں کوئی بھی شخص اپنے آپ کو ذہنی طور پر محفوظ اور مستحکم نہیں
سمجھتا۔ یہاں سب لوگ فریبوں اور سرابوں کے سہارے زندہ رہتے ہیں ہر آدمی
اپنے سپنوں کے بلبلے کے اندر مگن نظر آتا ہے۔ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے خوابوں
کے بلبلے کو توڑنا پسند نہیں کرتا۔ ایک اعتبار سے اسے ایک دوسرے کے لیے ہمدردی
کا دکھاوا کہا جا سکتا ہے۔ مان لیجیے، اس وقت حاضرین میں سے کوئی بڑھ کر مجھے
صاف صاف بتا دیتا کہ میری کارگزاری کے بارے میں اس کی حقیقی رائے کیا ہے
تو عین ممکن تھا کہ میری ساری خود اعتمادی ختم ہو جاتی اور اگلے دن میں کچھ بھی کام
کرنے کا اہل نہ رہتا۔

بعد میں بلراج کو فلم کی ہیروئن سینہہ لتا کے ساتھ ایک شاٹ میں آنا تھا۔ یہاں بھی خوب تماشا
رہا۔ سینہہ لتا نے "نئے رنگروٹ" کے ساتھ ریہرسل کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ "شاٹ کے دوران
اس نے مجھ سے بات چیت تو کی، مگر میری طرف دیکھا بالکل نہیں۔ اس کی نظریں کیمرے پر ہی مرکوز
رہیں۔ شاٹ کے پورے وقفے میں اس کے رویّے سے مجھ پر کچھ ایسا احساس طاری رہا جیسے میں کسی
بھیانک چھوت کی بیماری میں مبتلا ہوں، اس لیے اسے مجھ سے محفوظ فاصلے پر ہی رہنا چاہیے۔"

اس واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہوئے بلراج نے مزید لکھا ہے:

میرا خیال تھا کہ فلمی دنیا میں اونچ نیچ کی کوئی دیوار نہیں ہے۔ اب پتہ چلا کہ میرا
خیال بالکل غلط تھا۔ فلم انڈسٹری میں تو قدم قدم پر دیواروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
سماجی زندگی کے دوسرے شعبوں میں اگر یہ دیواریں گارے اور اینٹوں سے بنی ہیں
تو ہندی فلموں کی دنیا میں یہ سنگلاخ چٹانوں سے تعمیر کی گئی ہیں۔

مووی کیمرے سے بلراج کا پہلی بار سابقہ پڑا تو اس کے ساتھ ہی انھوں نے فلم انڈسٹری کی بناوٹی
سراب کو حقیقت باور کرانے والی دنیا میں بھی پہلی مرتبہ جھانک کر دیکھ لیا۔

جب فنی مجمدار کی "جسٹس" مکمل ہوئی تو بلراج کو اس فلم کا ایک پرائیویٹ شو دیکھنے کے
لیے بلا لیا گیا۔ بلراج کا کہنا تھا: "جب میں نے پردے پر اپنا کلوز اپ دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ
ایک بڑا سا پتھر میرے سر پر آ گرا ہے۔ میرا چہرہ کسی لاش کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ سپاٹ اور بے جان!

میک اپ نے اسے اور بھی بھونڈا بنا دیا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں اتنا مکروہ، اتنا وحشت ناک نظر آؤں گا۔" لیکن فنی مجمدار نے اپنا قول پورا کر دکھایا۔ اپنی اگلی فلم "دور چلیں" میں انھوں نے بلراج کو ایک اہم رول میں پیش کیا۔

رول حاصل کرنے سے بھی زیادہ دشوار مرحلہ بلراج کے لیے مووی کیمرے کے سامنے آنا تھا۔ ویسے اداکاری کے میدان میں وہ نووارد نہ تھے۔ اسٹیج کا کچھ تجربہ انھیں پہلے سے ہی تھا۔ پھر بی بی سی میں اناؤنسر کے طور پر بھی انھیں بہت کارآمد ٹریننگ مل چکی تھی۔ مائیکرو فون پر "عام انداز سے بولنے کا فن"، جس میں وقفے، تاکید، لہجے کے اُتار چڑھاؤ وغیرہ کا التزام، سب ہی کچھ شامل تھا، وہ انگلینڈ سے ہی سیکھ کر آئے تھے۔ یہ تربیت ان کے لیے ایک بڑا اثاثہ ثابت ہوئی۔ اس طرح ہندوستان اور انگلینڈ میں حقیقت نما اسٹیج کے تجربے نے فلم آرٹسٹ کے طور پر بلراج کو بالیدہ کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا، کیونکہ پارسی تھیٹر کے مبالغہ آمیز حرکات وسکنات، کھینچ تان، کود پھاند اور ان کے علاوہ گا کر، گنگنا کر، خطیبانہ انداز سے مکالموں کی ادئیگی کے برعکس حقیقت نما اسٹیج میں ہر حرکت اور ہر اشارہ فطری اور حقیقت سے قریب ہوتا تھا۔ لیکن بہر حال وہ وقت ابھی نہیں آیا تھا جب بلراج منجھے ہوئے فلمی اداکار شمار ہوئے۔ ابھی تو ان کی دوڑ دھوپ ہی جاری تھی۔ یہ دور اگلے چند برس تک چلا۔ فلمی دنیا میں قدم جماتے اور فلمی اداکاری کی ٹیکنیک سے اپنے آپ کو روشناس کرانے کے لیے جو جد وجہد وہ کر رہے تھے، وہ بلاشبہ بہت کڑی، بہت صبر آزما، بہت روح فرسا تھی۔

> کیمرے کے سامنے جانا میرے لیے پھانسی کے پھندے کے سامنے جانے سے کم نہ تھا۔ اپنے اوسان ٹھکانے رکھنے کے لیے مجھے بہت سخت کوشش کرنا پڑتی تھی۔ کبھی کبھی ریہرسل تو ٹھیک ہوجاتی، لوگ میری حوصلہ افزائی بھی کرتے، مگر ٹھیک شاٹ کے بیچ میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہوجاتی اور مجھے احساس ہوتا کہ میرے جسم کا ایک ایک عضو اکڑ گیا ہے، سن ہوگیا ہے، زبان حلق میں پھنس گئی ہے۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک ری ٹیک ہوتے رہتے۔ مجھے ایسا لگتا کہ میرے آس پاس کھڑا ہوا ہر شخص مجھے گھور رہا ہے۔ میں بہت جتن کرتا کہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک دوں اور اپنے رول، اپنی اداکاری پر ساری توجہ مرکوز رکھوں، لیکن ہر بات قابو سے باہر ہوتی چلی جاتی اور صرف یہ احساس میرے حواس پر چھا جاتا کہ اداکاری کے فن کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لیے بند ہوچکے ہیں۔

یہ کیفیت کافی عرصے تک قائم رہی - ایک اور فلم کا ذکر کرتے ہوئے، جو ایک آدھ سال بعد بنی تھی، بلراج نے انتہائی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

جب " ہم لوگ " سیٹ پر گئی تو میری حالت بالکل دگرگوں تھی .... کیمرے کا خوف، جو ' سینے پر دھرے ہوئے پہاڑ ' کی طرح مجھے ہمیشہ نڈھال کیے رہتا تھا، اب ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ انور حسین اس فلم میں میرے ساتھ کام کر رہے تھے. انھیں اداکاری کرتے دیکھ کر میری خود اعتمادی فوراً میرا ساتھ چھوڑ دیتی اور میں بالکل حواس باختہ ہو جاتا۔ شاٹس کا تو ذکر ہی کیا، میں ریہرسل بھی ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتا تھا۔ میری کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ جب میں تازہ ہوا میں چند سانس لینے کے لیے اسٹوڈیو سے باہر نکلا اور ایک بنچ پر دراز ہوگیا تو اپنی پتلون گیلی کر بیٹھا !

"جسٹس" کے بعد " دور چلیں " دوسری فلم تھی جس کا معاہدہ بلراج نے فنی مجمدار کے ساتھ کیا۔ " دور چلیں " میں بلراج کو ایک اہم سائڈ رول ملا تھا۔ کمل کپور اس فلم کا ہیرو تھا اور نسیم جونیئر ہیروئن۔ دمینتی کو بھی اس فلم میں کافی اہم رول دیا گیا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران بھی بلراج اِپٹا کی سرگرمیوں کے ریلے کی طرف بے اختیار کھنچے چلے گئے۔

اس کے بعد بلراج اپنا بیش تر وقت اور قوتِ عمل اِپٹا کی سرگرمیوں ہی کی نذر کرتے رہے. تاہم اس کے ساتھ فلم انڈسٹری میں بھی ان کی جدوجہد جاری رہی۔ " دور چلیں " کے بعد "گڑیا" آئی. یہ فلم ابسن کے مشہور ڈرامے " THE DOLL'S HOUSE " (گڑیا گھر) پر مبنی تھی - اس کے پروڈیوسر رجنی کانت پانڈے تھے اور ڈائریکٹر اجیت رائے راناڈے - بلراج اور دمینتی کو اس میں مرکزی رول ملے تھے۔

اس نئی فلم کے سیٹ پر جانے سے پہلے بلراج اور دمّو، دونوں اِپٹا کی مشہور فلم " دھرتی کے لال " میں اداکاری کا تجربہ حاصل کر چکے تھے، جسے خواجہ احمد عبّاس نے تحریر اور ڈائریکٹ کیا تھا۔ بلراج اس کی تیّاری میں بھی شریک رہے تھے۔ اس طرح فلم پروڈکشن کے ٹیکنیکی پہلوؤں سے بھی ان کا قریبی رابطہ ہوگیا تھا۔ " دھرتی کے لال " نے اپنی متعدد خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ایک نئی روش کی بنا ڈالی تھی، جسے بعد میں بمل رائے اور ستیہ جیت رے نے مزید نکھارا سنوارا اور بالیدگی کو پہنچایا۔ اس فلم میں خود بلراج کا کام بھی قابلِ تعریف رہا تھا - وہ رفتہ رفتہ اس گھبراہٹ

اور سراسیمگی سے چھٹکارا پا رہے تھے جو کیمرے کے سامنے آتے ہی ان پر سوار ہو جاتی تھی، لیکن یہ مرحلہ سہل نہ تھا۔ اس درمیان وہ فلمی دنیا کی بے نقاب، بے رحم حقیقتوں کا سامنا کرتے رہے، اُتار چڑھاؤ سے دوچار ہوتے رہے، صبر آزما حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس سے اگر ایک طرف ان پر اضمحلال طاری ہوتا تھا تو دوسری طرف ان کا یہ عزم بھی مزید مستحکم ہوتا تھا کہ جس میدان میں وہ بھٹک کر نکل آئے ہیں، وہاں انھیں کارنامہ ضرور کر دکھانا ہے۔

کیمرے کے سامنے کھنچے رہنے کی کیفیت سے بلراج کو کس طرح نجات ملی؟ اس کے لیے اندر ہی اندر انھیں شدید جدوجہد کرنا پڑی۔ اپنے حوصلے کو بلند کرنے کے لیے انھوں نے کئی ترکیبیں آزمائیں اسٹوڈیو میں جب وہ محسوس کرتے کہ ان کا سارا اندرونی وجود متزلزل اور لرزاں ہے تو وہ اپنے آپ سے کہتے: "میں ان لوگوں کو دکھا دوں گا کہ اچھی اداکاری کسے کہتے ہیں" یہ اعتماد کی بحالی کا ایک نسخہ تھا۔ دوسرا نسخہ یہ تھا کہ وہ اسٹوڈیو میں موجود ہر شخص کو نظر انداز کر دیتے، کسی بھی آدمی کی طرف نہ دیکھتے، اور کسی بہت جاں فزا شے کا تصور کرنے کی کوشش کرتے، مثلاً اپنی گڑیا سی بیٹی کے چہرے کا تصور، کسی پھولوں کی کیاری کے دل کش منظر کا تصور۔ اس طرح سے ان کے ذہن پر ایک خوش گوار کیفیت چھائی رہتی۔ کبھی کبھی اپنی خود اعتمادی کو جگانے کے لیے وہ جتن کر کے ایسی برہمی اپنے اوپر طاری کر لیتے جو خود کو برحق اور دوسروں کو برخود غلط سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے اور احتجاج کے رویّہ سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے علاوہ سیٹ پر دوسرے اداکاروں کی حرکات و سکنات کا بھی غور سے جائزہ لیتے رہتے، تاکہ 'فطری اداکاری' کی کنجی تک اُن کی رسائی ہو سکے۔

"دور چلیں" کی شوٹنگ کی یادیں دہراتے ہوئے بلراج نے لکھا تھا:

> میں نے دیکھا کہ شاٹ سے پہلے آغا ہم لوگوں سے بالکل معمول کے مطابق باتیں کرتے رہتے تھے، لیکن کیمرے کے اسٹارٹ ہوتے ہی ان کا انداز عجیب و غریب ہو جاتا اور وہ بالکل خبطی نظر آتے۔ ایک سے ایک مضحک حرکت ان سے سرزد ہونے لگتی۔ میں ان حرکتوں کو احمقانہ دکھاوا قرار دیتا۔ میں سمجھتا کہ آغا اوور ایکٹنگ کر رہے ہیں، جو ہندوستانی فلموں کا ایک بڑا، مگر بہت عام عیب ہے۔ پھر جب شاٹ ختم ہونے پر سب لوگ آغا کی کارگزاری کی تعریفیں کرنے لگتے تو مجھ پر جھلاہٹ سی سوار ہو جاتی۔ میں سوچتا کہ تعریف صرف میری ہونی چاہیئے، کیونکہ صرف میری اداکاری فطری ہے، صرف میرے فن میں ضبط کی کیفیت ہے، صرف میری

کارگزاری مناسب حدوں کے اندر رہتی ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ شاٹ شروع ہوتے ہی آغا اپنے رول میں 'داخل' ہو جاتے تھے۔ اور شاٹ ختم ہوتا تھا تو وہ رول سے 'باہر نکل کر' پھر آغا بن جاتے تھے۔ رول کو اس طرح طاری کر لینے کی بات میں نے پڑھ تو رکھی تھی، لیکن یہ نکتہ پھر بھی نہ سمجھ سکا تھا کہ جو کچھ میں کیمرے کے سامنے کر رہا ہوں، اسے اداکاری کا نام مشکل سے ہی دیا جا سکتا ہے۔

ایک اور فلم "ہلچل" (جس میں بلراج نے دلیپ کمار اور نرگس کے ساتھ کام کیا تھا) کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا تھا:

شاٹ سے صرف چند لمحے پہلے تک دلیپ کمار اور نرگس مزے سے بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ مگر جیسے ہی شاٹ شروع ہوتا، وہ اپنے اپنے رول میں 'داخل' ہو جاتے، جب کہ میں رول سے باہر ہی کھڑا رہ جاتا۔ فطری اداکاری کرنے کی کوشش میں بھی کرتا تھا۔ لیکن اُس وقت میں اِس گُر کو نہیں سمجھ سکا تھا کہ 'فطری' کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ پہلے رول میں گُم ہو جاؤ اور پھر فطری نظر آؤ، اور یہ کہ رول میں گُم ہونے کے لیے ایک خاص ذہنی عمل درکار ہوتا ہے۔ میں اس ذہنی عمل سے قطعی بے بہرہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان دنوں میں سوچا کرتا تھا کہ میں فطری اداکاری کر رہا ہوں، جب کہ دلیپ اور نرگس غیر فطری اداکاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ حقیقت میرے اس خیال کے بالکل برعکس تھی۔

بلراج دوسرے اداکاروں سے بھی مشورہ لیتے رہتے تھے۔ یہ خوبی کسی حقیقی فن کار میں ہی ہو سکتی ہے۔ ایک مرتبہ جب وہ ایک فلم میں ڈیوڈ کے ساتھ کام کر رہے تھے تو انھوں نے ڈیوڈ سے پوچھا "آپ کو اپنے مکالمے کس طرح یاد رہ جاتے ہیں؟ میں تو اپنے مکالمے ہمیشہ بھول جاتا ہوں"

ڈیوڈ نے بڑی محبت سے مجھے سمجھایا: "کسی بھی فقرے میں ہر لفظ کے پیچھے، ایک تصویر موجود ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اگر تم اس فقرے کا تصوّر کرو گے تو اپنے تصوّر میں تصویروں کا ایک سلسلہ دیکھو گے۔ اگر بولتے وقت تم تصویروں کے اس سلسلے پر اپنی توجہ مرکوز رکھو گے تو اپنے مکالمے کبھی نہ بھول سکو گے۔"

"گڑیا" کی تکمیل کے بعد زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ 29 اپریل 1947 کو دمینتی کا انتقال ہو گیا اور بلراج کے لیے زندگی کا سارا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا۔

وہ 1944 کے موسم گرما میں بمبئی آئے تھے۔ اس طرح ابھی تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ لیکن یہ عرصہ طوفانی مصروفیتوں میں گزرا تھا۔ ایک سطح پر رنگا رنگ تجربوں سے بھرپور، جوش و خروش اور سماجی وابستگی سے معمور مصروفیتیں تھیں، دوسری سطح پر جدو جہد، محرومی اور اذیت سے بوجھل سرگرمیاں۔

دمّو کی وفات کے کچھ دن بعد بلراج پہلے راولپنڈی اور پھر وہاں سے سری نگر گئے۔ اپنے دونوں بچّوں کو بھی وہ ساتھ ہی لے گئے۔ اُدھر بھی فضا پہلے جیسی نہ تھی۔ راولپنڈی ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کے چنگل میں پھنس چکا تھا اور ویرانی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ضلع کے دو سو سے زیادہ دیہات ملیامیٹ کیے جا چکے تھے۔ ان دیہات سے آئے ہوئے پریشان شرنارتھیوں سے راولپنڈی کی گلیاں کوچے پٹے پڑے تھے۔ پنجاب کے سارے علاقوں سے شرنارتھیوں کے قافلے رفتہ رفتہ امرتسر اور دہلی کی طرف کوچ کرنے لگے تھے۔ پنجاب کے کتنے ہی شہر دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ پاکستان کی تشکیل کا فیصلہ اصول کی حد تک ہو چکا تھا۔ بیش تر لوگ حیران و پریشان تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنے گھروں میں رہ سکیں گے یا رخصت ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

سری نگر میں تناؤ نسبتاً بہت کم تھا۔ لیکن تذبذب اور بے یقینی کا احساس یہاں بھی چھایا ہوا تھا۔

بلراج کا اپنا ذہن بھی دشتِ وحشت بنا ہوا تھا۔ دمّو سے جدائی کے صدمے میں خود اپنے آپ کو خطاکار سمجھنے کا اذیت ناک احساس بھی شامل ہو گیا تھا۔ اپنی روایتی صاف گوئی کے ساتھ بلراج نے یہ کیفیت اس طرح بیان کی تھی:

> انھوں نے اپنے لیے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی۔ وہ اپنے سیدھے سادے لباس شلوار قمیض میں ہی خوش رہتی تھیں۔ جہاں بھی جاتیں، خوشیوں کی جوت پھیلا دیتیں۔ ابھرتی ہوئی فلمی اداکارہ کی حیثیت سے وہ ہزاروں کما رہی تھیں، مگر اپنی کمائی کا بیش تر حصہ سماجی بھلائی کے کاموں کی نذر کرتی رہتی تھیں اور خود بڑے اطمینان سے بسوں میں گھومتی تھیں۔
>
> اس وقت میرا فرض تھا کہ ان کا ساتھ دیتا۔ ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کی قدر کرتا اور خانہ داری کے ادنیٰ جھیڑوں سے انھیں بچائے رکھتا۔ لیکن اپنی اوچھی طبیعت کی وجہ سے میں ان کی شہرت اور کامیابی سے غالباً جلنے لگا تھا۔ وہ اسٹوڈیو

سے تھکی ہاری آئیں تو میں چاہتا کہ وہ آتے ہی گھر کے کاموں میں لگ جائیں۔ مرد کے ٹٹو۔ پر اپنی برتری جتانے کی خاطر میں اپیا کے بہت سے غیر ضروری کام بھی اپنے سر لے لیتا۔ زبان پر ایک بار بھی حرفِ شکایت لائے بغیر دمّو نے اپنے اوپر کام کا اتنا بوجھ لاد لیا تھا جو ان کی بساط اور برداشت سے باہر تھا۔ اب ان باتوں کو یاد کرتا ہوں تو دل میں گہرائی تک نشتر سا اُتر جاتا ہے۔ دمّو ایک بیش بہا ہیرا تھیں، مگر قدرت نے اسے ایک غیر مستحق شخص کو عطا کر دیا تھا، جو اس کی قدر و قیمت نہیں جانتا تھا اور ایسی نعمت حاصل ہو جانے پر شکر بھی ادا نہیں کرتا تھا۔

سری نگر میں قیام کے دوران میں ہی بلراج کو ایک اور فلم "گنجن" میں ہیرو کے رول کی پیش کش کی گئی۔ اس فلم کی کہانی ہندی کے نام ور ادیب امرت لال ناگر نے لکھی تھی۔ چنانچہ جولائی 1947 میں بلراج پھر بمبئی آ گئے۔ بچّوں کو وہ سری نگر میں ہی چھوڑ آئے۔

"گنجن" کی کاسٹ میں بلراج کے ساتھ نلنی جیونت اور ترلوک کپور شامل تھے۔ ہدایت کاری کا بار نلنی جیونت کے شوہر وریندر ڈیسائی نے سنبھالا تھا۔ بمبئی میں پہنچنے پر بلراج کو پتہ چلا کہ فلم کے وہ اکیلے ہیرو نہیں ہیں۔ کہانی میں دو ہیرو تھے، جن میں سے ایک ہیرو کا رول بلراج کو دیا گیا تھا۔ یہ فلم بُری طرح فلاپ ہوئی اور اس طرح بلراج کی خود اعتمادی پر ایک اور بھرپور وار کر گئی۔

"کسی کردار کی عکاسی کرنے میں ایک نفسیاتی پہلو بھی کارفرما رہتا ہے، لیکن میں اس سے بالکل بے خبر تھا اور مجھے اس سے باخبر ہونے کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ کیمرے کے سامنے میں اکثر حواس باختہ ہو جاتا تھا اور اپنے اعضا کو اکڑتے اور بے لوچ بنتے ہوئے محسوس کرتا تھا، مگر میرا رویّہ ہمیشہ کسی مریض کے مانند رہا جو ہر وقت کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے اپنی بیماری کو چھپائے رکھتا ہے ــــ اس آس میں کہ ایک روز یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

اِپٹا کی سرگرمیوں میں بھی بلراج کا انہماک پہلے جیسی شدّت کے ساتھ ہی جاری رہا لیکن اب کمیونسٹ پارٹی کے اندازِ نظر اور سیاسی میلان میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد پارٹی نے نہرو سرکار سے ٹکّر لینے کا رویّہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نئی پالیسی کا اِپٹا کی کارگزاری اور طریقِ عمل پر بھی کافی اثر پڑا۔ اِپٹا باضابطہ طور پر کمیونسٹ تنظیم نہ تھی، لیکن اس کے ممبروں میں زیادہ تر بائیں بازو کے رجحان رکھنے والے ادیب اور فن کار ہی شامل تھے۔

پھر اس کی سرگرمیوں کی پہل دراصل کمیونسٹ پارٹی ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس لیے اب اپٹا کی طرف سے جو پروگرام پیش کیے جاتے تھے ان میں حکومتِ وقت پر نکتہ چینی روز بروز بڑھتی ہی جارہی تھی۔ دوسری طرف حکومت کی پالیسی میں بھی جبر کا عنصر روز بروز زور پکڑتا جارہا تھا۔ اپٹا کے بہت سے پُرانے کارکن اس ٹکراؤ کے رویّہ کے خلاف تھے اور رفتہ رفتہ اپٹا کی سرگرمیوں سے الگ ہوتے جارہے تھے۔ اُدھر کارپردازوں کا اندرونی اور مرکزی حلقہ بھی تفریق پسندی پر اُتر آیا اور کٹّرپن کے جوش میں کچھ پر 'ممینی اصلاح پسندی' کا الزام لگا کر انھیں تحریک سے نکال لینے تک کی نوبت کر بیٹھا۔ ہوتے ہوتے اپٹا کی منڈلیوں کی فردی طاقت گھٹتی چلی گئی۔ عوام کے سامنے شو پیش کرنا بھی ان کے لیے دشوار تر ہوتا گیا، کیونکہ پولیس ہر وقت ان کے پیچھے سائے کی طرح لگی رہتی تھی۔ تاہم بلراج پامردی کے ساتھ اپٹا کی سرگرمیوں سے اس وقت تک قریبی طور پر وابستہ رہے جب تک وہ (1949 میں) گرفتار نہ ہو گئے۔

دمّو کی وفات کے لگ بھگ دو برس بعد مارچ 1949 میں بلراج نے سنتوش سے شادی کر لی۔ سنتوش ہماری رشتے کی بہن تھیں۔ بلراج اپنی تنہائی اور ذہنی اذیت سے گھبرا کر ان کی طرف پلٹے تھے۔ اس کے ساتھ نوجوانی کے دنوں کی جذباتی وابستگی بھی پھر اُبھر آئی تھی۔ جس کیفیت کو محض ان کی نوجوانی کی "ترنگ اور" قرار دیا گیا تھا، وہ اس پوری مدّت میں مکمل طور پر فنا کبھی نہیں ہوئی تھی۔ دمّو سے شادی ہو جانے کے بعد بھی یہ کیفیت بلراج کے اندرونی وجود میں بار بار سر اُٹھاتی رہی تھی اور انھیں کافی ذہنی اور جذباتی انتشار سے دوچار کرتی رہی تھی۔ لیکن پھر یہ جلد ہی ماند پڑ جاتی تھی۔ اس کا سبب بلراج اور دمّو کی باہمی چاہت اور احترام اور اندازِ نظر کی یکسانیت تھے۔ ازدواجی زندگی کے ہر گزرتے ہوئے برس کے ساتھ ان کی محبّت اور ذہنی ہم آہنگی بڑھتی ہی گئی تھی۔ ایسے میں 'ماسوا' کا خیال نہ آنا تعجب خیز نہ تھا۔ مگر اب بلراج اور سنتوش، دونوں اکیلے تھے، دونوں بے پتوار کی کشتی کے مانند تھے۔ سنتوش اپنے سابق شوہر ایس۔ ایچ۔ واتسیاین سے الگ ہو جانے کے بعد انگلینڈ چلی گئی تھیں۔ وہاں گزر بسر کے لیے وہ بی بی سی اور دوسرے اداروں کے لیے اِدھر اُدھر کے کام کرتی رہتی تھیں۔ تاہم بلراج سے سنتوش کی شادی سے دونوں ہی گھرانوں کے بزرگ بہت سٹپٹائے، کیونکہ ہندوؤں میں قریبی رشتے کی بہن سے شادی کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ بلراج نے کے۔ آصف کی فلم "ہلچل" میں کام کرنے کے لیے معاہدہ کیا۔ بلراج کے علاوہ اس فلم کی کاسٹ میں دلیپ کمار اور نرگس بھی شامل تھے۔ بلراج کو ایک جیلر کا رول دیا گیا تھا، جو ہیروئن کا شوہر بھی ہے۔ ستم ظریفی یہ رہی کہ ڈائرکٹر صاحب ایک روز بلراج کو

جیل کی زندگی اور جیلر کے فرائض وغیرہ سے روشناس کرانے کے لیے بمبئی کی آرتھر روڈ جیل میں بھی لے گئے۔ اور پھر کچھ ہی دن بعد بلراج ایک مظاہرے میں حصہ لیتے ہوئے گرفتار کیے گئے اور اسی جیل میں پہنچا دیے گئے۔ بے چارہ جیلر، جس سے بلراج آصف کے ہمراہ مل چکے تھے، اکثر قیدی کی وردی میں ملبوس بلراج کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا اور بڑبڑاتا: "میرا خیال ہے، میں تمھیں کہیں دیکھ چکا ہوں۔"

بلراج کی گرفتاری سے "ہلچل" کے شوٹنگ پروگرام میں بھی خلل پڑا۔ پھر جلد ہی ایسا بندوبست کر لیا گیا کہ شوٹنگ کے دنوں میں بلراج کو پیرول پر رہا کرالیا جاتا، تاکہ اپنا رول ادا کر سکیں۔ شوٹنگ کے بعد وہ پھر جیل میں پہنچ جاتے۔

بلراج اپنی دوسری شادی کے دو ہفتے بعد ہی گرفتار ہو گئے تھے۔ گھر پر بھی حالات زیادہ سازگار نہ تھے۔ ہمارا خاندان دہلی میں رہ رہا تھا، جہاں ایک شرنارتھیوں کی کالونی میں پتاجی نے ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا تھا۔ بلراج کے بچے ابھی چھوٹے چھوٹے سے ہی تھے۔ پریکشت نو برس کا ہوگا، شبنم مشکل سے پانچ سال کی تھی۔ گزر بسر بھی تنگی ترشی کے ساتھ ہوتی تھی۔

بلراج کے دل پر بوجھ بننے اور ذہن کو تناؤ میں مبتلا کرنے والی کتنی ہی باتیں اس وقت یکجا ہو گئی تھیں۔ بلراج سیاسی کارکنوں کی صف میں تو جا نکلے تھے لیکن خالص سیاسی سطح پر جدوجہد کرنے کے رموز سے وہ بے خبر ہی تھے۔ اس میدان میں بہت کچھ تھا جو انھیں چکرا دینے کے لیے کافی تھا۔ گھر کی خیر خبر بھی انھیں کم ہی ملتی تھی۔ نرگس کی ماں کبھی کبھی ایسا انتظام کر دیتی تھیں کہ جب بلراج پیرول پر چھوٹ کر شوٹنگ کے لیے آئیں تو بلراج کی بیوی بھی اسٹوڈیو میں پہنچ جائیں۔ اس طرح دونوں کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اپنے گھر والوں سے بلراج کا بس ایک ہی رابطہ رہ گیا تھا۔ اور پھر جیلر کے رول میں اداکاری بھی انھیں فن کارانہ آسودگی کم ہی بخش رہی تھی۔

جیل میں چھ مہینے گزارنے کے بعد بلراج کو رہائی مل گئی۔ مگر جیسی فضا کی طرف ان کی واپسی ہوئی وہ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھی۔ اپٹا زوال اور انتشار سے دوچار تھی۔ بلراج کی مالی حالت واجبی سی ہی ہو رہی تھی۔ فلم انڈسٹری میں قدم جمانے کی جدوجہد ابھی تک اتنی ہی کڑی اور صبر آزما تھی جتنی پہلے تھی۔ انھیں اکثر یہی محسوس ہوتا کہ وہ پھر نئے سرے سے اس دوڑ کا آغاز کر رہے ہیں جس سے پتہ نہیں کچھ حاصل بھی ہونے والا ہے یا نہیں۔

"میں بمبئی کے منحوس شہر میں کیوں واپس آ گیا؟ کیا یہ میری بدبختی نہیں؟ کیوں نہ میں پنجاب کو لوٹ جاؤں اور اپنے ہی لوگوں کے ساتھ رہوں؟ آخر میں یہاں آ کر

کیا رہا ہوں ؟ مگر نہیں، اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ حالات وہاں لازماً بہتر ہوں گے ؟ مجھے یہیں مالی طور پر اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے، یہیں اپنے کام میں مہارت حاصل کرنا ہے۔ مجھے اور بھی کڑی محنت کرنا ہوگی۔ فلموں میں کام کر کے مجھے خوشی نہیں ہوتی تو نہ سہی، مگر اداکار کے طور پر مجھے بہر طور کام یاب ہونا ہے پنجاب کو لوٹ جانے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔"

ان دنوں بلراج کی مالی حالت اتنی پتلی ہو رہی تھی، اس کی عکاسی ایک پُر درد واقعہ سے ہو رہی ہے۔ ہوا یہ کہ دیوالی کے روز جب بلراج شام کو گھر واپس آئے تو انھوں نے اپنے دونوں بچوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا۔ پریکشت اپنی بہن شبنم کو سمجھا رہا تھا: "پٹاخے بھی کیا واہیات چیز ہیں۔ لوگ بے کار میں ہی پیسہ برباد کرتے ہیں۔ کچھ حاصل نہ وصول"

یقیناً بچوں کو گھر کی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ بات چیت کا یہ حصہ کانوں میں پڑا تو بلراج کا دل تڑپ اُٹھا۔ وہ الٹے قدموں گھر سے نکل گئے، ایک دوست سے کچھ رقم اُدھار لی اور بچوں کے لیے آتش بازی اور مٹھائی لے کر ہی گھر میں گھُسے۔

روزی کمانے کے لیے بلراج طرح طرح کے کام ہاتھ میں لیتے رہے۔ انھوں نے سنتوش کے ساتھ مل کر ایک روسی فلم کی ہندوستانی میں ڈبنگ کی۔ چیتن آنند کی اگلی فلم کا اسکرین پلے اور مکالمے لکھنے کا معاہدہ انھوں نے پورا کیا۔ یہ فلم بعد میں "بازی" کے نام سے بنی۔ ان کے چھوٹے بیٹے پریکشت کو بھی "ہلچل" میں رول مل گیا۔ اسے ہیرو کے بچپن کا پارٹ ادا کرنا تھا۔ پریکشت کے لیے نتن بوس کی فلم "دیدار" میں ایک اور رول کی پیش کش بھی ہوئی۔ اپنے ننھے سے بیٹے کے لیے یہ رول بلراج نے بہت بے دلی کے ساتھ، مجبوری کے عالم میں قبول کیے۔

"ہلچل" کے فوراً بعد بلراج کو ضیا سرحدی کی فلم "ہم لوگ" میں ایک رول مل گیا۔ اس میں بلراج کو نچلے متوسط طبقے کے گھرانے کے ایک بے روزگار نوجوان کے روپ میں اپنا نقش جمانا تھا۔ یہ پہلی فلم تھی جس میں بلراج اپنی صحیح کیفیت میں نظر آئے اور اپنی گھبراہٹ اور سپاٹ پن سے چھٹکارا پانے میں کام یاب رہے۔ اس تجربے کو انھوں نے خود بھی بیان کیا ہے، جو دل چسپ بھی ہے اور انکشاف انگیز بھی۔

جب "ہم لوگ" کی شوٹنگ شروع ہوئی تو حسب معمول میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس روز میں کسی بھی شاٹ میں ٹھیک طرح اداکاری نہ کر سکا۔ شام کو اسٹوڈیو سے

رخصت ہوتے وقت میں نے ضیا سے کہا: "تم نے مجھ پر جو اعتماد کیا ہے، میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ بڑی مشکل سے تو تمھیں اس فلم کی ڈائریکشن کا کام ملا ہے، اب میری وجہ سے تم کیوں نقصان اُٹھاؤ۔ یقین جانو، اگر میری جگہ تم کسی اور کو لے لوگے تو مجھے ذرّہ برابر بھی ملال نہ ہوگا۔" اس پر ضیا نے فوراً جواب دیا: "بلراج۔ اس مہم میں ہم پار لگیں یا ڈوب جائیں، یہ طے ہے کہ کام ہم دونوں مل کر ہی کریں گے۔" اس جواب میں جو بے پناہ ہمدردی اور فراخ دلی چھپی ہوئی تھی، اسے محسوس کرکے میرا دل بھر آیا۔

گھر پہنچ کر جب بیوی سے مڈبھیڑ ہوئی تو مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، دیوار سے اپنا سر ٹکرانے لگا، چیخ چیخ کر کہتا رہا: "میں کبھی ایکٹر نہیں بن سکتا ۔۔۔ کبھی نہیں۔" اسی وقت اتّفاق سے ضیا کا نوجوان اسسٹنٹ ناگرتھ ہمارے گھر آ گیا۔ اس کی عمر مشکل سے 19 سال ہوگی۔ مجھے اس حالت میں دیکھا تو چلّا چلّا کر مجھے بُرا بھلا کہنے لگا: "بزدل کہیں کا! اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتا ہے، جب کہ حقیقت میں اس کی روح دولت مند لوگوں کے پاؤں چاٹتی ہے۔ تمھیں خود پر شرم آنی چاہیے۔ ڈوب مرو کہیں جاکر۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ منھ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ بس ٹکر ٹکر ناگرتھ کو دیکھتا رہا اور وہ اسی طرح زور زور سے گرجتا برستا رہا: "تم اداکاری نہیں کر سکتے؟ بکواس! سراسر بکواس! تم دوسروں سے یقیناً بہتر اداکاری کر سکتے ہو۔ مگر اس وقت تک تم مات ہی کھاتے رہوگے جب تک ان کی شہرت اور دولت تمھیں مرعوب کرتی رہے گی۔ انور دولت مند ہے، وہ نرگس کا بھائی ہے اسی لیے اس کے سامنے تم آزادی کے ساتھ سانس بھی نہیں لے سکتے۔ حسد تمھیں اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ تمھاری نظریں فن پر نہیں، دھن پر ہیں۔ دولت تمھاری نظر میں سب سے بڑی ہے، سب سے اہم ہے . . . . "

ناگرتھ مجھے اپٹا کے ایک ڈرامے "سڑک کے کنارے" میں دیکھ چکا تھا، جس میں میں نے ایک بے روزگار، بیمار نوجوان کا رول ادا کیا تھا۔ پورے ڈرامے میں یہ نوجوان سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف زہر اُگلتا رہتا ہے۔ میں اس رول کو بہت جوش کے ساتھ، بہت پُر اثر انداز سے ادا کیا کرتا تھا۔ "ہم لوگ" میں بھی میرا رول اسی قسم

کا تھا۔ پھر میں دیوار سے اپنا سر کیوں پھوڑ رہا تھا ؟

ناگرتھ نے بالکل پتے کی بات کہی تھی۔ اس نے میرے رول کی اصل روح کی نشان دہی کر دی تھی ـــــ نفرت ! ہر شے سے نفرت۔ خود زندگی سے نفرت۔ انتہا نفرت۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا اکڑا ہوا، منجمد سا جسم پُرسکون ہو رہا ہے، معمول پر آ رہا ہے۔ ساری رات میں اپنے اندر نفرت کے شعلوں کو ہوا دیتا رہا۔ اگلی صبح جب میں اسٹوڈیو پہنچا تو اس ظالم، جابر، غیر منصفانہ نظام کے خلاف میری رگ رگ میں نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی اور میرا ذہن کھول رہا تھا .... اور پھر یہ دیکھ کر مجھے خود بھی حیرت ہوئی کہ اپنے مکالمے مجھے بالکل ٹھیک یاد ہیں۔ ریہرسل میں اپنے مکالمے میں نے اس طرح ادا کیے جیسے کوئی باز کسی چڑیا پر جھپٹ رہا ہو۔ ضیا نے فوراً بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا....

ضیا خوش تھے۔ میں ان کی امیدوں پر پورا اُترنے لگا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ جو کچھ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ کسی قدر غیر واقعاتی ہے، لیکن اُس رول کے تقاضوں کے مطابق یہی انداز صحیح اور برمحل تھا۔ یوں میری کشتی بھنور سے نکل آئی۔ خوش قسمتی سے میرے مکالمے بھی خطیبانہ جوش اور ڈرامائی گونج گرج سے بھرپور تھے ....

"ہم لوگ" کامیاب رہی۔ بلراج کی اداکاری نے زبردست تاثر چھوڑا۔ اگرچہ اعلیٰ پائے کے اداکار کے طور پر اپنے قدم جمانے کے لیے انھیں ابھی تھوڑی سی مسافت اور طے کرنا تھی، تاہم ابتدائی رکاوٹوں کو وہ بہرحال پار کر چکے تھے۔ مالی اعتبار سے بھی وہ خود کو ذرا زیادہ آسودہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ابھی انھیں بہت سے اُتار چڑھاؤ دیکھنے تھے۔ "ہم لوگ" کے بعد "بدنام" آئی، جو بُری طرح فلاپ ہوئی۔ پھر انھیں ایک فلم "سولہ آنے" لکھنے اور ڈائریکٹ کرنے کا معاہدہ ملا جس سے ان میں کافی ولولہ جاگا۔ مگر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا۔ آخر جب انھیں "دو بیگھہ زمین" میں کام کرنے کا موقع ملا تو ان کی صلاحیتیں کھُل کر، آزادی کے ساتھ بروئے کار آئیں۔ اس فلم میں رول کے ساتھ ان کی ہم آہنگی تقریباً مکمل نظر آئی اور انھوں نے ایک باکمال فلم ایکٹر کی حیثیت سے اپنا نقش جما کر ہی چھوڑا۔

"دو بیگھہ زمین"

بمبئی کے مضافاتی علاقے جوگیشوری میں اُترپردیش سے آئے ہوئے گھوسیوں (دودھ والوں) کی ایک کالونی ہے۔ جب بلراج کا "دو بیگھہ زمین" کے لیے انتخاب ہوا تو وہ اسی روز سے اس کالونی

کے چکر لگانے لگے۔ وہ غور سے مشاہدہ کرتے رہتے کہ یہ غریب گھوسی کس طرح اپنا کام دھندا کرتے ہیں، کیسے اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے ہیں، کس ڈھنگ سے بات چیت کرتے ہیں۔ بلراج نے لکھا ہے:

یہ گھوسی (جو بمبئی میں 'بھیا' کہلاتے ہیں) اپنے سر پر 'گمچھا' باندھنے کے بہت شوقین ہوتے ہیں اور یہ کام ہر شخص اپنے الگ انداز سے کرتا ہے۔ میں نے بھی جوش میں آکر ایک 'گمچھا' خرید ڈالا اور اسے باندھنے کی مشق کرنے لگا۔ مگر میں اس فن میں زیادہ مہارت پیدا نہ کرسکا۔ "دو بیگھہ زمین" میں میری کامیابی بڑی حد تک ان گھوسیوں کی زندگی کے اس قریبی مشاہدے کی رہین منت ہے۔

بلراج جب پہلی اس فلم کے سیٹ پر گئے تو اپنے رول کے لیے دل میں بہت لگن اور جوشش محسوس کر رہے تھے، کیونکہ یہ رول ان کی دلی آرزو کے عین مطابق تھا۔

اس فلم کی کچھ شوٹنگ کلکتہ میں ہونے والی تھی۔ وہاں جانے کے لیے بلراج نے جان بوجھ کر تیسرے درجے کے ڈبے میں سفر کیا، تاکہ اپنے رول کے احساسات سے پوری طرح آگاہ ہوسکیں، یہ دیکھ سکیں کہ گاؤں والے کس طرح ڈبے میں چڑھتے، اُترتے، کیسے لیٹتے، بیٹھتے اور باتیں کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک سین گھر کے اندر لیا جانا تھا۔ کلکتہ میں رکشا چلانے والوں کے یونین کے دفتر میں گئے اور ان لوگوں کی مدد سے انھوں نے رکشا چلانے کے سارے رموز سیکھے۔

لیکن ایک مرحلہ پر آکر وہ ایک بار اپنے اوسان کھو بیٹھے اور انھیں یہ خیال ستانے لگا کہ وہ اس رول کے ساتھ انصاف نہ کرسکیں گے۔ بلراج کے اپنے لفظوں میں:

میں سٹپٹایا ہوا تھا، الجھن میں مبتلا تھا۔ بے حد مضمحل تھا۔ دل پر بوجھ لیے میں اپنی رکشا میں جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک ادھیڑ عمر کا رکشا والا جو کچھ دور کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا، میرے پاس آیا۔ صورت شکل سے وہ جوگیشوری کے 'بھیاؤں' جیسا ہی نظر آرہا تھا، مگر بے چارا بہت کمزور اور دُبلا پتلا تھا۔ ہلتے ہوئے دانت آگے کو نکلے ہوئے تھے۔ چہرے پر جھرّیاں ہی جھرّیاں تھیں۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے، بابو؟" اس نے پوچھا۔

"فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا آپ بھی اس میں کام کر رہے ہیں؟"

"ہاں بھئی۔"

"آپ کو کیا پارٹ ملا ہے ؟"
یہ سوچ کر کہ اس شخص سے بات چیت کرنے سے میرے ذہن کو کچھ دیر کے لیے اضمحلال کے بوجھ سے چھٹکارا مل جائے گا، میں اسے اس فلم کی کہانی اسی طرح سنانے لگا جیسے ایک بار رشی کیش مکرجی نے مجھے سنائی تھی۔ کہانی سن کر اس پر بھی وہی ردِعمل ہوا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بے اختیار بہہ نکلے۔ رُندھے ہوئے گلے سے کہنے لگا: "یہ تو میری اپنی کہانی ہے، بابو، یہ تو میری اپنی کہانی ہے۔"
اس رکشا والے کی بھی بہار کے ایک گاؤں میں دو بیگھ زمین تھی۔ پندرہ برس پہلے اس نے یہ زمین زمین دار کے پاس رہن رکھ دی تھی۔ اور اپنی زمین کو چھڑانے کی دھن میں پندرہ سال سے وہ کلکتہ کی سڑکوں پر رکشا چلا رہا تھا۔ مگر یہ امید اس کا ساتھ چھوڑ چلی تھی کہ وہ کبھی اپنی زمین کا مالک بن سکے گا۔ وہ تھوڑی دیر تک میرے پاس ہی کھڑا ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا، پھر بار بار یہی دہراتا ہوا چلا گیا: "یہ تو میری اپنی کہانی ہے، بابو، یہ تو میری اپنی کہانی ہے۔"
اسی لمحہ میرے اندر ایک آواز اُبھری: بھاڑ میں جائے اداکاری کا فن! .... بھلا مجھ سے زیادہ خوش نصیب شخص کون ہوگا، جسے ایک بے بس، مجبور، مصیبت زدہ تمام آدمی کی کہانی ساری دنیا کو سنانے کا موقع اور اعزاز ملا ہے۔ ہاں، مجھے یہی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس سے قطعِ نظر کہ میں اس منصب کو حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرنے کا اہل ہوں بھی یا نہیں۔ اب کچھ بھی ہو جائے مجھے اپنی ساری قوت اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں صرف کرنا ہے۔ اگر اس ذمہ داری سے منھ چڑاؤں گا تو یہ بزدلی ہوگی، خطا ہوگی، گناہ ہوگا۔
بس پھر کیا تھا، میں نے اس اَدھیڑ عمر کے اس رکشا چلانے والے کی روح کو اپنے وجود میں سمو لیا اور اداکاری کے فن کے بارے میں سوچنا بالکل چھوڑ دیا۔ میرا خیال ہے، اس رول میں میری غیر متوقع کام یابی کا راز یہی تھا۔ اس روز اداکاری کا بنیادی گُر اچانک میرے ہاتھ لگ گیا تھا، اور وہ بھی کسی کتاب سے نہیں، خود زندگی سے۔ اداکار اپنے رول سے جتنا ہم آہنگ ہوگا، اتنا ہی زیادہ کام یاب رہے گا۔ 'مہابھارت' میں جب ارجن تیر چلانے والے تھے تو ان کی نظر صرف پرندے کی آنکھ پر یعنی اپنے

نشانے پر، مرکوز رہی تھی ....

ایک فلمی ناقد نے 'امرت بازار پتریکا' میں میرے اس رول کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا تھا: "بلراج ساہنی کی اداکاری میں جینیس کی جھلک ہے۔" مجھے اعتراف ہے کہ جینیس کا یہ رنگ مجھے اُس اَدھیڑ عمر کے رکشا چلانے والے نے عطا کیا تھا۔

سوویٹ یونین میں ایک فلم پروڈیوسر کا کہنا تھا: "بلراج ساہنی کے چہرے پر ایک پوری دنیا جلوہ گر ہے۔" یہ دنیا بھی اسی رکشا چلانے والے کی تھی کیسی شرم کی بات ہے کہ آزادی کے پچیس برس بعد بھی یہ دنیا بدلی نہیں ہے ....

جس روز موت مجھے اپنے آغوش میں لینے کو آگے بڑھے گی تو میری روح مطمئن ہو گی کہ میری زندگی رائیگاں نہیں گئی، کیونکہ "دو بیگھہ زمین" میں، میں اداکاری کر چکا ہوں۔

"دو بیگھہ زمین" کو شہ سرخیوں میں جگہ ملی۔ بلراج کی دھاک جم گئی۔ ان کی شہرت مستحکم ہوئی لیکن مالی تحفظ کی منزل ابھی دور تھی۔ اس لیے کچھ وقت اور درکار تھا۔ "دو بیگھہ زمین" ریلیز ہونے کے لگ بھگ چھ مہینے بعد انھیں نئی فلم کا معاہدہ ملا۔ یہ نئی فلم راما نند ساگر کی "بازوبند" تھی

بمبئی میں وارد ہونے کے تقریباً دس برس بعد فلم ایکٹر کے طور پر قدم جمانے کے لیے بلراج کی جدوجہد کا دور انجامِ کار تمام ہو ہی گیا۔ اس وقت تک وہ 41 سال کے ہو چکے تھے۔ اب آکر وہ مقام آیا کہ لوگ نئے نئے رول کی پیش کش لے کر ان کے گرد منڈلانے لگے۔ ان کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ پروڈیوسران کے طلب گار تھے۔ "اولاد"، "ٹکسال"، "آکاش"، "راہی" وغیرہ کے معاہدے انھوں نے اسی زمانے میں کیے۔ 1944 سے 1954 تک کی دہائی میں انھوں نے مشکل سے دس فلموں میں کام کیا ہوگا، مگر اس کے بعد اپنی زندگی کے اگلے 19 برس میں انھیں پوری 120 فلموں میں آنا تھا۔

دس برس کا عرصہ جدوجہد کے لیے بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے —— اور وہ بھی اس حال میں کہ تنِ تنہا اصولوں کا پابند رہ کر جدوجہد کی جائے، سر ہمیشہ اونچا رہے، کردار کی بلندی پر کبھی آنچ نہ آئے۔

ایک روز میں پتاجی کی پرانی ڈائریوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میری نظر ایک اخبار کے تراشے پر پڑی، جسے پتاجی نے ڈائری کے ایک صفحے پر چپکا کر رکھا تھا۔ یہ 24 / اپریل 1954 کے اخبار کا تراشا تھا اور اس میں "اولاد" پر تبصرہ موجود تھا۔ تبصرے میں کہا گیا تھا:

> بلراج ساہنی، جس نے دل کی پوری لگن کے ساتھ غریب اور مصیبت زدہ عام آدمی کا رول اپنے لیے انتخاب کیا ہے، اس رول میں بڑے فطری رنگ سے جچتا ہے۔ انسانی

دردمندی کا یہی وصف، جو اس کی شخصیت میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے، اس کی امتیازی قوّت ہے، اس کی کشش ہے، اس کی تاثیر ہے۔ "دو بیگھہ زمین" میں جو کسان تھا، وہی "اولاد" میں ایک نوکر ہے۔ دونوں فلموں میں اس کا رول ایک محبّت شعار شوہر اور شفیق باپ کا ہے، جو حالات کے جبر و ستم کے خلاف لڑتا رہتا ہے۔ دونوں رول المیہ ہیں، کیونکہ دونوں حقیقی ہیں۔

پتاجی کو اب بلراج کے کارناموں پر بجا طور پر ناز ہونے لگا تھا، اس لیے اس قسم کے تراشے انھیں جہاں سے بھی ہاتھ لگ جاتے تھے، وہ انھیں محفوظ کر لیتے تھے۔ ایک کے بعد ایک ہر فلم میں بلراج کی اداکاری بے ساختہ، فطری اور انسانی ہمدردی کے جذبے سے لبریز ہونے کے باعث تماشائیوں کے دلوں پر گہرے سے گہرا نقش جماتی جا رہی تھی۔

اپنے آپ کو دریافت کرنے اور اپنے مستحکم وجود کو پانے کے لیے بلراج جو کاوش کرتے رہے تھے وہ ایک طویل عرصے پر محیط تھی۔ اس مدّت میں اُس عمل کی جھلکیاں جا بجا ملتی ہیں جس سے وہ گزر رہے تھے اور جس کے پورے ہونے پر انجام کار وہ اپنے بے لوچ پن اور خود حسی وغیرہ جیسی کوتاہیوں سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوئے۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا: "اگر ہونٹوں کی حرکت میں سہولت، آرام اور سکون کا رنگ ہو تو آدمی فطری اداکاری کر سکتا ہے۔" ایک اور موقع پر انھوں نے یہ نکتہ بیان کیا: "اپنی حرکات اور تاثرات کو ہلکا اور مدّھم رکھنا چاہیے، زیادہ پھیلا پھیلا اور مبالغہ آمیز نہیں۔ یہ اور دوسرے بہت سے اقوال ان کے لیے مشعلِ راہ بنے تھے۔ ان ہی کے ذریعہ انھوں نے خود کو بہت کچھ سکھایا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کافی مطالعہ بھی کیا تھا۔ کبھی وہ اسٹانزلاوسکی کی مشہورِ زمانہ کتاب "AN ACTOR PREPARES" (اداکار تیار ہوتا ہے) پڑھتے نظر آتے، جسے وہ اپنے لیے اداکاری کی بائبل کا درجہ دیتے تھے، کبھی کلارک گیبل کی بیوی کی تصنیف "ماڈرن ایکٹنگ" کے مطالعہ میں منہمک رہتے، جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ چونکہ یہ کتاب انھوں نے شعور پختہ ہونے سے پہلے پڑھی تھی، لہٰذا ان کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔

اگر میک اپ کی ایک موٹی تہہ اداکار کے چہرے پر تھوپ دی جائے تو وہ فطری انداز سے اپنا رول کیسے ادا کر سکتا ہے؟ اُس وقت مجھے یہ علم نہ تھا کہ فطری اداکاری کی بلندی کو چھونے کے لیے بہت سی بندشوں اور حد بندیوں کو نہ صرف قبول کرنا پڑتا ہے، بلکہ

اپنے آپ کو ان کے سانچے میں ڈھالنا بھی پڑتا ہے۔
ایک اور جگہ انھوں نے لکھا ہے:

فن کار کی زندگی تضادوں اور پیچیدگیوں سے ہمیشہ بھری رہتی ہے۔ کبھی کبھی اس کے کردار کی کم زوریاں اور کوتاہیاں ہی اس کی فن کارانہ نشوونما کو بڑھاوا دینے لگتی ہیں۔

یہ نکتہ انھوں نے چارلی چپلن کی مثال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بیان کیا تھا۔ چارلی چپلن کی خود نوشت سوانح عمری پڑھ کر انھیں یہ محسوس ہوا کہ جب تک یہ مشہورِ زمانہ اداکار اپنی غریبی اور گم نامی کے دنوں کی روداد سناتا ہے، اس کی زندگی کی کہانی بے حد دل نشیں اور پُر اثر معلوم ہوتی ہے، مگر جب اس کی کامیابی کا دور شروع ہوتا ہے اور وہ اپنے نجی معاملوں میں الجھ جاتا ہے اور امرا اور ان کی بیگمات کی رفاقت میں رہتا ہے تو اس کی داستانِ حیات پھیکی اور بے رنگ ہونے لگتی ہے۔ اس تجربہ کے بعد بلراج کہتے ہیں: "اور اس کے باوجود یہی وہ دور تھا جب اس نے دنیا کو اپنی بہترین فلمیں دیں"

کسی حد تک یہ بات بلراج پر بھی صادق آتی ہے۔ انھیں جب فلموں میں کامیابی ملی تو اس کے ساتھ فلمی دنیا سے اور خود اپنے آپ سے ناآسودگی کا جذبہ بھی پیدا ہوا، کبھی کبھی یہ احساسِ جرم بھی جاگا کہ وہ اپنے ضمیر سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ عجیب سے محرکات بھی ابھر کر سامنے آنے لگے۔ چنانچہ شہرت اور کامیابی کے ساتھ نجی اور گھریلو معاملوں میں ان کا انہاک بھی بڑھتا گیا۔ اور اس کے باوجود یہی وہ دور تھا جب بلراج نے بھی اپنی اداکاری کے بہترین نمونے پیش کیے۔

ایک اور موقع پر بلراج نے اچھی اداکاری کی دو شرطوں "روک تھام اور شدّت" کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ ایک جنگی فلم میں لارنس اولیور کی اداکاری کو زوردار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

اس فلم میں وہ مہمان آرٹسٹ ہے۔ اس کا رول بھی چھوٹا سا ہے۔ وہ ہوا بازی کے محکمے کا سربراہ بنا ہے۔ ایک سین میں وزارتِ دفاع کو ٹیلی فون کر کے مزید ہوائی جہاز طلب کرتا ہے 'I WANT MORE AEROPLANES' (مجھے مزید ہوائی جہاز چاہئیں) ـــــ یہ جملہ وہ لہجے کی ایسی شدّت، اور اس کے باوجود روک تھام کی سی کیفیت کے ساتھ بولتا ہے کہ اسے سنتے ہی میرے تو سارے وجود میں تھرتھری دوڑ گئی۔ محض اس ایک جملے سے تماشائیوں کو اس بات کا بھرپور احساس ہو جاتا ہے کہ ملک کیسی ہولناک صورتِ حال سے دوچار ہے۔

روک تھام اور جوش و جذبہ ـــــ اداکاری کے غالبًا یہی دو کلیدی اصول تھے جو انھیں سب سے

زیادہ عزیز تھے۔ یہی وہ آدرش تھا جسے وہ آزادی کی معراج سمجھتے تھے۔ برسوں پہلے ایک بار وہ مجھ سے شیکسپیئر کے ڈرامے 'کنگ لیئر' کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے دو لفظوں کی طرف خاص سے مجھے دھیان دلایا جو لیئر انتہائی اندرونی تناؤ اور کرب کے لمحوں میں بولتا ہے: " UNBUTTON HERE " (یہاں سے بٹن کھولو) پھر کہنے لگے "لیئر کی اندرونی اذیت کو صرف یہ دو الفاظ ایسے بھرپور ڈھنگ سے بیان کر دیتے ہیں جو کسی خطیبانہ گونج گرج سے معمور پوری تقریر کے ذریعہ بھی ممکن نہ تھا۔

بلراج قوی تخیل اور حقیقت پر مضبوط گرفت کو بھی اداکار کے لیے بہت اہم لوازم سمجھتے تھے۔ اچھا اداکار تو ہر شخص بن سکتا ہے، مگر عظیم اداکار بننے کے لیے ایسے تخیل کا ہونا ضروری ہے جو بیک وقت قوی بھی ہو اور بلند پرواز بھی۔

فن میں حقیقت نگاری کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

حقیقت نگاری کی بنیادی خصوصیت یہی ہے کہ یہ فن کو ایک تیسری جہت عطا کرتی ہے۔ اپنے ہر رول میں، خواہ اسے میں نے اسٹیج پر ادا کیا ہو یا پردۂ فلم پر، میں اسی تیسری جہت کا اضافہ کرنے کے لیے کوشاں رہا ہوں۔ فن کار کے لیے یہ راہ انتہائی کٹھن ہوتی ہے، لیکن یہی ایک راہ ہے جسے طے کر کے وہ تخلیق کے حقیقی سرور سے آشنا ہو سکتا ہے۔ اداکار کو اپنا رول ایسے واضح اور جیتے جاگتے انداز سے پیش کرنا چاہیے کہ ہر قدم پر اس کی شخصیت کا کوئی نیا رُخ تماشائیوں کے سامنے نمایاں ہو جائے۔

کسی کردار کے بیشتر احساسات کا اظہار اشارات، حرکات و سکنات، انداز اور اداؤں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ کردار کی عکاسی اسی صورت میں بھرپور اور انکشاف انگیز ہوتی ہے جب کردار نگاری کے ان رموز کی ٹھیک طرح پیروی کی جائے۔ لیکن محض ان بیرونی اشاروں کی مہارت اداکار کو فن کی بلندی تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہ مہارت اداکاری میں صفائی، سجیلاپن اور ایک طرح کی استادانہ شان تو پیدا کر سکتی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اداکاری کے فن کا اصل منشا کسی کردار کی روح کو بے نقاب کرنا ہوتا ہے، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب فن کار انسانیت پرست ہو، جب وہ جی جان کے ساتھ کردار سے ہم آہنگ ہو جائے۔ جب

اس کا شعور جبلّی طور پر کردار کے اندرونی وجود کا عرفان حاصل کرلے۔

بلراج کا کارنامہ یہی تھا کہ فنِ اداکاری کے اس بنیادی پہلو کو انھوں نے جی جان سے اپنا لیا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ کرداروں کی عکاسی اس طرح کرنے میں کام یاب رہے کہ اس پر حقیقت کا گمان گزرے۔ بیرونی اشارتوں اور انداز واطوار کی بھی بہت اہمیت ہے، کیونکہ سماج میں کسی فرد کے طرزِ عمل کی وضاحت ان سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن کچھ اشارتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے وسیلے سے روح اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ لیئر کے منھ سے نکلے ہوئے صرف دو الفاظ مناسب اشارتوں کے ساتھ مل کر اس تمام کرب واذیت کو نمایاں کردیتے ہیں جو لیئر کے دل کو پارہ پارہ کیے ہوئے ہے۔ اسی قسم کی بلیغ اشارتوں کے معاملے میں بلراج نے امتیازی شان حاصل کی۔ ان ہی کے ذریعہ انھوں نے جیتے جاگتے ڈھنگ سے کرداروں کی عکاسی کی۔ تاہم بیرونی انداز واطوار اور بیرونی رویّوں کو بھی انھوں نے نظر انداز نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے تھے: "آدمی کی چال ڈھال دیکھو۔ اس سے تمھیں اس کے کردار کا سراغ مل جائے گا۔" اس طرح کے مشاہدے کے لیے وہ بہت محنت کرتے تھے۔ اپنے رول سے ملتے جلتے شخص یا اشخاص کا وہ گھنٹوں اور کبھی کبھی کئی کئی دن تک جائزہ لیتے رہتے، غور سے دیکھتے رہتے کہ ان کے انداز کیسے ہیں، طرزِ عمل کیسا ہے، وہ کیسے اُٹھتے بیٹھتے ہیں، کس ڈھنگ سے بولتے ہیں۔ جب "کابلی والا" فلمائی جارہی تھی تو انھوں نے سود پر قرض دینے والے پٹھانوں کی وضع زندگی کا مطالعہ کرنے میں کئی دن لگائے تھے۔ اس طرح کئی دن انھوں نے اس مشاہدے کی نذر کیے تھے کہ تانگے والے تانگہ کس طرح چلاتے ہیں۔ اس جائزے کی بدولت ہاتھ وغیرہ کی جو مخصوص اشارتیں وہ سیکھتے تھے، ان سے ان کی اداکاری میں حقیقت کا رنگ جھلکنے لگتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ آپ کسی فلم میں بلراج کی اداکاری کے بارے میں سوچیں تو آپ کے ذہن میں متعلقہ رول اور کردار آئیں گے، خود اداکار بلراج نہیں۔ بلراج کی کردار سازی ہر فلم میں اپنا الگ اور نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ہر رول واضح طور پر طبع زاد اور بلراج کی اپنی شخصیت کی چھاپ سے آزاد ہے۔ بلراج اپنے آپ کو کردار پر مسلط نہیں کرتے، بلکہ اپنی ہستی کو کردار کی شناخت میں ضم کردیتے ہیں اور اس عمل میں وہ اس لیے کامیاب رہتے ہیں کہ کردار کے ساتھ ان کی تخیّلی ہم آہنگی اور ہم زبانی شدید اور مکمّل ہوتی ہے۔

"اداکاری فن ہی نہیں، علم بھی ہے،" بلراج نے ایک جگہ کہا ہے۔ "علمی خطوط پر مطالعہ اور مشق کرکے کوئی بھی شخص اچھا اداکار بن سکتا ہے۔"

اچھا اداکار بننے کے لیے اپنے رول سے تخیّلی ہمدردی اور ہم آہنگی رکھنے کے علاوہ سماجی

تناظر کی بھی بڑی اہمیت ہے، یعنی اداکار میں یہ اہلیت بھی ہونی چاہیئے کہ وہ رول کو وسیع تر سماجی پس منظر میں رکھ کر دیکھ سکے۔ بلراج کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں مارکس واد کی بہت قدروقیمت ہے۔

جن لوگوں کو مارکس واد کا علم نہیں ہے، وہ اسے صرف ایک سیاسی نظریہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ مارکس واد فطرت اور زندگی کے ہر پہلو کا سائنٹفک زاویہ سے جائزہ لیتا ہے۔ یہ بہت سی غلط فہمیوں اور باطل تصوّرات کو ہمارے ذہن سے دور کردیتا ہے اور حقیقی صورتِ حال کا جلوہ ہمیں دکھاتا ہے۔ میرے خیال میں آج کے دور میں مارکس واد کا مطالعہ ایک فن کار کے لیے بھی اتنا ہی مفید ہے جتنا کسی ماہر عمرانیات یا سیاست داں کے لیے۔

ایک دن بلراج اور میں پُرانی دلّی کے ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑے تھے۔ اتنے میں ڈاک خانے کا ایک کلرک بلراج کے پاس آیا اور کہنے لگا "ہم لوگوں کے بارے میں آپ کب کوئی فلم بنائیں گے؟ کیا ہم لوگ آپ کی توجہ کے حق دار نہیں ہیں؟" حقیقت یہ ہے کہ بلراج نے اپنے آپ کو سماج کے غریب اور پچھڑے ہوئے طبقوں کا خاص طور سے چہیتا بنا لیا تھا۔ نچلے متوسط طبقے کے لوگ، دکانوں کے ملازم، ریلوے کارکن، کلرک، ٹیچر اور اسی طرح کے دوسرے لوگ انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی گہری تخیلی ہمدردی بھی معاون ثابت ہوتی تھی، لیکن اس سے بھی زیادہ ان کی سماجی وابستگی، عوام کے لیے خود کو وقف کردینے کا رویہ اور وسیع سماجی تناظر ان کے لیے عوامی قبولیت کی راہ ہموار کرتے تھے۔ کیونکہ ان ہی کی وجہ سے وہ ان لوگوں کی زندگی کے اندرونی دکھ درد اور احساسات و جذبات کو اپنے فن میں سمونے میں کام یاب رہے تھے۔

بلراج بہت جفاکش فن کار تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شدید محنت اور کام کے لیے خود کو پوری طرح وقف کردینے کے جذبے سے بڑھ کر کوئی بھی شے فن کار کو نکھارنے، سنوارنے کے کام نہیں آتی۔ محنت کے علاوہ بلراج میں اور بھی کئی قابلِ توجہ اوصاف تھے جنھوں نے فن کار کے طور پر ان کی نشوونما میں مدد کی۔ ان میں سے ایک وصف ان کا انتہا کی حدوں کو چھوتا ہوا انکسار تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں سے سیکھتے رہتے تھے۔ جلن یا حسد کا جذبہ ان کے دل میں کسی کے لیے بھی پیدا نہیں ہوا۔ فن کارانہ عجز ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ سیکھنے کو جو بھی، جس سے بھی، جہاں سے بھی مل جائے، اس کی پذیرائی کے لیے وہ ہمیشہ آمادہ رہتے تھے۔ فلمی دنیا میں جلن، کڑھن، حسد، اسکینڈل، پیٹھ پیچھے وار، افواہ بازی وغیرہ کا ہر آن دور دورہ رہتا ہے۔ خود بلراج کے پاس بیسیوں کہانیاں

سنانے کو موجود ہوتی تھیں۔ لیکن بلراج کی نظر میں فن کار کا فن اہم تھا، اس کی روزمرّہ کی چھوٹی موٹی باتیں نہیں۔ چنانچہ یہ ماجرا اکثر نظر آتا کہ محفل میں کسی نئے اسکینڈل کا ذکر چل نکلا ہے یا کسی شخص کے بارے میں تازہ ترین کہانی بیان کی جارہی ہے اور بلراج تقریباً وجد میں آکر کہہ اُٹھتے ہیں: "مگر تم ذرا فلاں فلم میں اس کی اداکاری دیکھو۔ کتنا عظیم اداکار ہے! واہ! آفریں، صد آفریں!" اصلیت یہ تھی کہ فن کا جلوہ دیکھتے ہی ان پر سرور طاری ہوجاتا تھا۔ پھر وہ فن پیش کرنے والے شخص کو بھی بھول جاتے تھے، اس کی کوتاہیوں کو بھی، اچھے، بُرے اعمال کو بھی۔ صرف اس شخص کا رول بلراج کی نگاہوں کے سامنے روشنی بکھیرتا رہتا تھا اور بلراج جوش میں آکر اس کی تعریفوں کے پُل باندھتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی شاید ان تعریفوں میں بے جا جوش کی وجہ سے مبالغہ کا رنگ بھی آجاتا تھا۔ لیکن یہ صلاحیت ان میں بہر حال تھی کہ جب وہ کسی کو تعریف کا حق دار سمجھتے تو دل کھول کر اسے سراہتے، اور یہ بلاشبہ ان کی ایک خوبی تھی۔ سیٹ پر دلیپ کمار کو اداکاری کرتے ہوئے وہ گھنٹوں دیکھا کرتے تھے اور دلیپ کی اداکاری کا سہل اور پُر وقار انداز سیکھنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ مینا کماری، گیتا بالی اور دوسرے فن کاروں کی فن کارانہ صلاحیت اور کمال کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زبان تھکتی ہی نہیں تھی۔

1945 میں بلراج کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہوئے ایک فلمی تبصرہ نگار نے لکھا تھا:

> بلراج پچھلے دنوں دہلی ہی میں تھے۔ 'اوڈین' میں ان کی فلم کا پریمیر تھا۔ شو جب ختم ہونے کو تھا تو بلراج چپکے سے سنیما ہال میں گھس آئے۔ بہت سے لوگ تو انھیں پہچان بھی نہ سکے، اور وہ تھے کہ بڑے اطمینان کے ساتھ بھیڑ میں شامل ہوکر چپ چاپ سنیما ہال سے باہر نکل گئے۔ اس شخص میں غضب کا انکسار ہے، اور وہ بھی سراسر حقیقی۔

بلراج اپنے انکسار کو قائم اور برقرار رکھنے میں اس لیے بھی کامیاب رہے کہ سماجی زندگی میں فلم ایکٹر کے مقام اور اہمیت کے باب میں وہ کبھی کسی ناروا خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہے۔ ایک مرتبہ وہ اور میں ایک کارڈیگن جیکٹ خریدنے کے لیے کناٹ پلیس کی ایک دکان میں جا گھسے۔ جیسا کہ عموماً ہوا کرتا تھا، لوگوں نے انھیں پہچان لیا۔ چنانچہ جب دکان سے باہر نکلے تو ان کے پرستاروں کی بھیڑ پہلے ہی وہاں جمع ہوچکی تھی۔ جب لڑکوں، لڑکیوں نے ڈائریوں، کرنسی نوٹوں اور کاپیوں وغیرہ پر آٹوگراف حاصل کرنے کے لیے انھیں گھیر لیا تو وہ مسکراتے رہے، شائستگی کے ساتھ آٹوگراف دیتے رہے۔ اور اس کے ساتھ بھیڑ سے باہر نکلنے کا راستہ بھی بناتے رہے۔ مگر ہمارے کار کے پاس پہنچنے تک ہجوم کافی زیادہ ہوگیا۔

لوگوں نے تعریفی نعرے لگائے، بلراج سے ہاتھ ملایا، خوب جوش و خروش کا اظہار کیا۔ جب انجام کار ہم کار میں بیٹھ کر آگے بڑھ ہی گئے تو میں نے بلراج سے کہا: "شان دار! دیکھا، لوگ آپ کو کتنا چاہتے ہیں!"

بلراج دھیرے سے مسکرائے اور بولے: "تم نے صرف ان کی واہ وا اور تعریفی نعرے سنے ہیں، ہوٹنگ اور تحقیری شور نہیں۔ تمھیں پتہ نہیں کہ ایکٹر کی پیٹھ مڑتے ہی یہ لوگ کس طرح اس کی ہنسی اُڑاتے ہیں اور اسے لولو بناتے ہیں۔ ان کے جوش و خروش سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے وہی سستی شہرت حاصل ہے جو ایک ایکٹر کے نصیب میں آتی ہے۔ اتنی بھیڑ تو یوں ہی بے کار کے تجسّس اور اشتیاق کی وجہ سے جمع ہو جاتی ہے۔"

اس طرح لوگ بلراج کی صلاحیت کو حقیقی معنوں میں داد دیتے تھے یا اس سے محض بے کار کا تجسّس اور اشتیاق ظاہر ہوتا تھا، اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ خود بلراج اس طرح کی 'مقبولیت' کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ایک روز انھوں نے مجھ سے یہ ضرور کہا تھا: "پتہ نہیں جب میں پھر گم نامی کی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں گا تو میرے دل پر کیا گزرے گی۔ شاید میں شہرت کی چاندنی میں جینے کا اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ گم نامی کو جھیلنا میرے لیے دشوار ہو جائے گا۔" لیکن اس شہرت کی حقیقی نوعیت ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہی تھی اور اس سلسلے میں انھوں نے سراب آسا تصوّرات کو اپنے ذہن سے دور ہی رکھا تھا۔

ایک اور موقع پر بلراج نے مجھے اپنا ایک واقعہ سنایا، جو اہم بھی ہے اور پُر اثر بھی۔ اداکار کی زندگی بلراج کی نظر میں کیسی تھی، یہ واقعہ اس پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

"تمھیں ——— یاد ہے؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

میں اس اداکارہ کو کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ میری پسندیدہ اداکاراؤں میں سے ایک تھی۔ اثبات میں میرا جواب سنتے ہی بلراج نے کہا:

"تو سنو۔ ایک دن ——— اور میں ایک بس اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ دراصل کچھ دیر پہلے میں اس سے ملنے کے لیے گیا تھا اور وہ مجھے رخصت کرنے کے لیے بس اسٹاپ پر آئی تھی۔ کچھ نوجوانوں نے مجھے دیکھ لیا اور میرے پاس آ کر آٹوگراف مانگنے لگے۔ ——— پر ان میں سے ایک نے بھی دھیان نہیں دیا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی، شرم بھی آئی۔ میں نے ان لڑکوں کو بتایا کہ یہ خاتون کون ہیں، ان سے کہا کہ یہ ——— ہیں،

مشہور فلم اسٹار، لاکھوں دلوں پر راج کرنے والی۔ مگر اس کے بعد بھی ان نوجوانوں نے اس اداکارہ سے آٹوگراف کی فرمائش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ حشر ہوتا ہے اداکار کا! ایک سہانی صبح کو یکایک اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ ماضی کی گرد میں گم ہو چکا ہے۔

میں نے جب ان کی رائے سے اتّفاق نہیں کیا تو وہ کسی قدر جھلّا گئے۔ پھر کر انھوں نے ایک ایک کرکے کئی اپنے وقت کے نامور فلمی ستاروں کا ذکر کر ڈالا جو اب محرومی اور محتاجی کے دن کاٹ رہے تھے اور جن کی پروا کسی کو نہ تھی۔

بمبئی میں جتنی برباد، شکستہ، نامراد روحیں ہیں، فن اور ثقافت کے کسی بھی دوسرے میدان میں نہ ہوں گی۔ یہاں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ایک فلم کے ذریعہ اپنا نقش بھی جمایا ہے، مگر اس کے بعد تقدیر کی انوکھی گردش کے باعث وہ ریلے سے باہر ہو گئے اور اسی طرح کے دوسرے 'موقع' کے لیے برسوں انتظار کرتے رہے، لیکن یہ 'موقع' کبھی نہیں آیا۔ یہاں ایسے اشخاص ہیں جو چھوٹے چھوٹے رول قبول کرکے اپنا کیریر شروع کرتے ہیں اور اسی قسم کے رول ادا کرتے کرتے ان کی عمر گزر جاتی ہے، تاہم یہ آس انھیں ہر آن رہتی ہے کہ ایک روز وہ بہتر رول ادا کرکے دھوم مچا دیں گے۔ اور ایسے اُمید کے قیدیوں کی تعداد سیکڑوں، ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ شبہ، تذبذب اور بے اعتباری کی فضا فلمی دنیا پر ہمیشہ چھائی رہتی ہے۔ صلاحیت کی ہولناک بربادی اس دنیا کا عام دستور ہے۔ اگر ایک اداکار کامیابی کی بلندی پر کھڑا نظر آتا ہے تو سیکڑوں ایسے بھی ہیں جو کام کی تلاش میں در در مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور یہ ساری اندھی دوڑ کس لیے ہے؟ صرف پست سطح کی کاروباری، تفریحی فلمیں بنانے کے لیے!

دوسری طرف ہیرو کو دیکھیے۔ وہ امپورٹیڈ کاروں میں گھومتا پھرتا ہے۔ اس کا رہن سہن شان دار ہے۔ اس کی وضعِ زندگی، ملک کی عام حالت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی۔ لیکن اندر ہی اندر وہ بھی خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اس بے رحم حقیقت کا شعور اسے ہر وقت رہتا ہے کہ جس کاٹھ کے گھوڑے پر وہ سوار ہے، وہ اُسے کسی بھی لمحہ گرا سکتا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے معاملے میں یہ صورتِ حال اور بھی

زیادہ الم ناک روپ اختیار کرتی ہے۔

بلراج کو اس موہوم سی، غیر حقیقی سی کیفیت کا احساس ہمیشہ رہا جو اداکار کی زندگی پر بھی اسی طرح مسلط رہتی ہے جس طرح پوری دنیا پر، جس کا بلراج خود بھی ایک حصہ تھے۔

ہم، جو لوگوں کو ہنساتے اور رلاتے ہیں، جو انھیں ایک طلسماتی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں، رفتہ رفتہ خود بھی اُسی دنیا میں رہنے لگتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو بھی ایک فلم یا ڈراما بنا دیتے ہیں اور اس طرح اپنے تماشائیوں کے لیے اور بھی زیادہ تفریح کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔

ایک اور موقع پر انھوں نے کہا تھا:

جو تصوراتی شبیہیں پردۂ فلم پر متحرک نظر آتی ہیں، فلم آرٹسٹ کی زندگی کی حقیقتوں کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔

اپنی فلمی زندگی کا بلراج جب ذکر کرتے تھے تو اس میں معذرت یا دل پر چرکے لگانے والے احساسِ جرم کا رنگ ضرور شامل ہوتا تھا۔ اس کا سبب کیا تھا؟ بناوٹی انکسار؟ جی نہیں، اصل وجہ اتنی سطحی ہرگز نہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ایک حساس شخص ان حالات کے تئیں اپنا فطری ردِ عمل ظاہر کرتا تھا جن کا چلن ثقافت کے میدان میں تھا۔ ان بیانات سے اس کی بے اطمینانی جھلکتی تھی، کوئی قابلِ قدر کام کر دکھانے کے لیے اپنی قوت کو وقف کرنے کی شدید خواہش نمایاں ہوتی تھی۔ بلراج نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس میں آدرش وادرچا ہوا تھا۔ بچپن کے دنوں میں انھیں گھر میں آریہ سماجی ماحول ملا تھا، جہاں پتا جی سماج سدھار کی ضرورت پر اپنا زورِ بیان صرف کرتے رہتے تھے۔ بعد میں جب تحریکِ آزادی نے زور پکڑا تو فضا قوم پرستانہ اُمنگوں، ولولوں اور وطن کے لیے سب کچھ تج دینے کے جذبے سے معمور ہوگئی تھی۔ ان ہی دنوں اس دور کے دو عظیم آدرش وادیوں، گاندھی اور ٹیگور کے بہت قریب رہنے کا موقع بلراج کو ملا۔ اور پھر جب وہ مارکس واد پر ایمان لے آئے تو ایک نئی وابستگی کا احساس ان کے ذہن پر چھا گیا۔ یہ وابستگی دکھ درد کی ماری انسانیت کی فلاح وبہبود کے نصب العین سے تھی۔ ایسا شخص اس میدانِ عمل کی سنگین حقیقتوں سے کیسے سمجھوتا کر سکتا تھا جہاں فن ہمیشہ مات کھاتا ہے اور دولت کی قدریں ہمیشہ راج کرتی ہیں۔ وہ اکثر محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک ایسی مشین کے پُرزے ہیں جو فن کو کاروبار بنا رہی ہے، اسے پستی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اس مشین کے پُرزے کی حیثیت سے دولت مند اور مشہور بن جانا ان کی نظر میں زیادہ اہمیت نہیں

رکھتا تھا۔ اس سے انھیں نہ ذاتی طمانیت کا احساس ہوتا تھا، نہ کچھ کر دکھانے کی آسودگی میسّر آتی تھی۔
ان کے ناآسودہ رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی اوّلین ادبی کاوشیں ادب کے میدان میں ان کے خوش آئند مستقبل کی پیامی تھیں۔ اپٹا کی سرگرمیاں بھی انھیں فن کارانہ آسودگی بخشتی رہیں، کیونکہ ان سرگرمیوں میں منہمک رہ کر وہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک بہتر سماج کے لیے جاری رہنے والی تحریک میں شریک ہیں، اپنے تماشائیوں کو ایک نیا شعور دے رہے ہیں، عوامی بیداری کا وسیلہ بن رہے ہیں۔
ادب کے میدان میں اور اپٹا کے اسٹیج پر، دونوں جگہ فرد کی کوشش کی کافی اہمیت تھی۔ لیکن بدنظمی اور افراتفری کی ماری لمبی چوڑی فلمی دنیا میں بلراج فرد کے طور پر کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے کہ وہ اپنا وقت، اپنی زندگی برباد کر رہے ہیں، اس میدان کے لیے وہ بنے ہی نہیں، وغیرہ۔

ویسے انھیں پورا یقین تھا کہ فن کے وسیلۂ اظہار کے طور پر فلم بہت زبردست اور مؤثر وسیلہ ہے۔
اپنے انداز سے انھوں نے کئی بار اچھی، صحت مند، ترقی پسند فلمیں بنانے کی راہ میں پہل بھی کی۔ مثال کے طور پر کشمیری زبان میں پہلی فلم "مہجور" ان ہی کی پیش قدمی کی بدولت بن سکی تھی۔ اس فلم میں مشہور کشمیری شاعر مہجور کی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی اور اس میں بلراج اور ان کے بیٹے پریکشت، دونوں نے کام کیا تھا۔ (پریکشت نے اس عظیم شاعر کا رول ادا کیا تھا۔) اسی طرح بلراج نے شری راجندر بھاٹیہ کی فلم "پوتر پاپی" کی تکمیل میں بھی مدد دی تھی۔ یہ فلم پنجابی ادیب نانک سنگھ کے ایک ناول پر مبنی تھی، جس کا عنوان "پوتر پاپی" ہی تھا۔ بلراج کی یہ دلی خواہش بھی تھی کہ ان کے وطن پنجاب میں ایک فلم اسٹوڈیو بنے۔

فلم پروڈکشن کے کچھ پہلوؤں کی حد تک بلراج کے خیالات میں کافی شدّت اور قطعیت تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ادب کی طرح فلم کی جڑیں بھی عوام کی زندگی میں ہونی چاہئیں۔ بنگال میں اچھی فلمیں اس لیے بنتی ہیں کہ بنگال ایک باہم پیوستہ اور مربوط، یک رنگ اور یک جہت ثقافتی وجود کا نام ہے۔ وہاں کے فلم ساز خود بنگال کے عوام کی صفوں سے آئے ہیں۔ وہاں زبان اور کلچر ایک ہی ہے اور ادیبوں اور فلم سازوں کا قریبی رابطہ رہتا ہے۔ ہندی فلموں کے معاملے میں یہ ثقافتی یک رنگی موجود ہی نہیں۔ ہندی فلمیں بمبئی میں بنائی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں ہندی بولی جاتی ہے، کوئی فلم اسٹوڈیو ہے ہی نہیں۔ چنانچہ بمبئی میں فلمی کارکنوں کا ایک رنگا رنگ انبوہ فلمیں "ڈھالنے" کے کام میں لگا رہتا ہے۔ ان میں ایکٹر اور پروڈیوسر (زیادہ تر پنجاب سے آئے ہوئے)

لکھنے والے اور ٹیکنیشین، سب ہی شامل ہیں۔ بمبئی کی فلمیں عوام کی زندگی کے بطن سے جنم نہیں لیتیں۔ اکثر اوقات یہ باکس آفس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر بنائی جاتی ہیں اور کسی نہ کسی فارمولے کی حد بندیوں کے تابع رہتی ہیں۔ اسی لیے ان فلموں میں صرف سطحیت اور اُتھلاپن ہوتا ہے۔ بمبئی کے فلم ساز کے ذہن میں ثقافتی تناظر کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کوتاہی کا ثبوت فلم سازوں کے اس رویّے سے بھی ملتا ہے جو وہ فلم کے منظر نامہ کے ضمن میں روا رکھتے ہیں۔

ہندی فلموں میں منظر نامہ کے تئیں جو رویّہ اپنایا جاتا ہے وہ مشینی انداز کا ہوتا ہے۔ (باہر کی فلموں میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے)۔ یہاں پہلے کہانی کا خاکہ طے کرلینے کے بعد منظر نامہ کا منصب صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ مناظر میں جا بجا مکالمے ملادیے جائیں۔ کبھی کبھی تو مناظر اور مکالمے اس وقت تک لکھے بھی نہیں جاتے جب تک فلم کی شوٹنگ شروع نہ ہو جائے! اور یہ تماشا تو اکثر ہوتا ہے کہ ادھر کیمرا مین روشنیاں وغیرہ درست کرانے کے بعد شاٹ لینے کا انتظار کر رہا ہے اور اُدھر جلدی جلدی مکالمے گھسیٹے جارہے ہیں! .....

ان دنوں ششی دھر مکرجی کو باکس آفس کا جادوگر سمجھا جاتا تھا۔ ان کی کوئی فلم ناکام نہیں ہوئی تھی۔ جس فارمولے کی وہ پیروی کرتے تھے، وہ نہایت سیدھا سادہ تھا۔ منظر نامہ کو وہ جان بوجھ کر پوچ اور کم زور رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ منظر نامہ میں جان نہ ہوگی تو تماشائی نہایت بے صبری کے ساتھ ناچ، گانے کے سین کا منتظر رہے گا۔ اگر منظر نامہ میں اتنی کشش ہوئی کہ وہ اس میں کھو کر رہ گیا تو اسے ناچوں اور گیتوں میں کم دل چسپی محسوس ہوگی جو باکس آفس کے نقطۂ نظر سے اچھا نہ ہوگا۔ اسی طرح کی دلیلیں دے کر مکرجی کہا کرتے تھے کہ ہندی فلموں کی کامیابی کی قابلِ اعتبار بنیاد ایک ہی ہے، اور وہ ہے گیت۔

میرا خیال ہے کہ مناظر اور مکالموں کو الگ الگ لکھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ منظر نامہ تو پودے کی طرح ہوتا ہے، جس کے سارے حصے — جڑیں، تنا، شاخیں، پتّے، سب کے سب فطری ترتیب سے ہی فطری روپ میں پروان چڑھتے ہیں ....

بلراج نے تقریباً 135 فلموں میں اداکاری کی اور ان میں کچھ رول تو انھوں نے اس طرح ادا کیے کہ یادگار بن کر رہ گئے۔ اکثر ہندی فلموں کی تمام تر سطحیت اور میلوڈرامائی کیفیت کے باوجود وہ اصلیت سے قریب، دل کو چھولینے والے، جیتے جاگتے رول پیش کرنے میں کامیاب رہے تو اس کا سبب یہ تھا

وہ اپنے حساس، فن کارانہ مزاج کے ساتھ نظر کی وسعت اور گہرا شعور لے کر فلموں میں آئے تھے۔ ان کے امٹ نقش چھوڑنے والے کرداروں کا تصویر خانہ بھرا پُرا بھی ہے اور رنگا رنگ بھی۔ مثلاً کلرک (گرم کوٹ)، کسان (دو بیگھہ زمین)، گھریلو نوکر (اولاد)، پٹھان (کابلی والا)، سنہ نار بھی (وقت)، بل کا دولت مند مالک (ایک پھول دو مالی)، مسلمان تاجر (گرم ہوا)۔ یہ اداکاری کے ان اعلیٰ فن پاروں کی صرف چند مثالیں ہیں جن میں بلراج نے اپنی شخصیت کو اپنے رول میں پوری طرح ضم کر دیا ہے۔ اپنے مخصوص پس منظر، ذہنی ساخت اور محبوب قدروں کے باعث یہ احساس انھیں اکثر ستاتا تھا کہ فلمی دنیا میں وہ غلط آکر پھنس گئے ہیں۔ پھر اس احساس کی بدولت ان کا کام اور بھی زیادہ دشوار، ان کی جدوجہد اور بھی زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہو جاتی تھی۔ ایک اعتبار سے وہ ہمیشہ بہاؤ کے مخالف رُخ پر تیرتے رہے اور کبھی کبھی یہ عمل نہایت مشکل اور صبر آزما بن جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے آپ کو آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے "اس کاروبار کے ہتھ کنڈے" بھی نہیں اپنائے، بلکہ اپنے رویّہ اور طرزِ عمل میں ایک فن کار کے شرف اور وقار اور ناز کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ فلمی دنیا کی سیاست میں وہ کبھی نہیں الجھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارے ملک میں فلم آرٹسٹ کا کیریر شاخِ نازک پر بنے ہوئے آشیانہ کی طرح ہوتا ہے۔ خود آرٹسٹ کا اپنے کیریر پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس کی باگ دوسرے عوامل کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ یہاں ہر بات کا حساب اور تعیّن فلم کے باکس آفس پر چلنے کے امکانات کرتے ہیں۔ ان حدبندیوں کے باوجود بلراج نے فن کے طور پر اپنی سالمیت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ دوسری طرف کچھ خیال پرست آدرش وادیوں کے برعکس یہ تصور بھی ان کے ذہن پر آسیب بن کر کبھی مسلط نہیں ہوا کہ وہ ایک نئی راہ روشن کرنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ اپنا جائزہ اپنے سے بے تعلق ہو کر، بے لاگ ڈھنگ سے لے سکتے تھے، اس لیے یہ اندازہ لگانے میں انھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ فلمی دنیا کے کون سے چھوٹے گوشے کو انھیں آباد کرنا ہے، اور پھر اس گوشے کو شایانِ شان انداز سے آباد کرنے کے لیے انھوں نے جی جان سے محنت بھی کی۔ ایسا موقع شاید ہی کبھی آیا ہو جب کسی ڈائریکٹر کی طرف سے انھیں غلط فہمیاں ہوئی ہوں یا کسی پروڈیوسر سے ٹکراؤ کی نوبت آئی ہو۔ ان کی جتنی جدوجہد تھی، فن کار کی حیثیت سے اپنے آپ سے ہی تھی۔ اس جدوجہد میں اور باتوں کے علاوہ ان کے انکسار، ان کے سیکھنے اور قبول کرنے کے لیے آمادہ ذہن، ان کے حقیقت کو بے لاگ ہو کر سمجھ لینے کے رویّہ نے بھی بہت مدد کی، جس کے نتیجے میں وہ انجامِ کار کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ اس طرح اپنے الگ ڈھنگ سے انھوں نے ایک نئی راہ بھی روشن کر دکھائی۔

"اب تک میرا وطیرہ یہی رہا ہے کہ ایمان داری سے کام کروں، غیرت اور عزتِ نفس کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑوں۔ اگر یہ اوصاف مجھ سے چھن گئے تو میں خود بھی ملیامیٹ ہو جاؤں گا ...."

(22 جون 1954 کے خط سے اقتباس)۔

ایک اور موقع پر میں انھیں یہ لکھنے کی جسارت کر بیٹھا کہ ایک صاحب سے میرے بارے میں چند سفارشی کلمات کہہ دیں۔ جواب میں انھوں نے لکھا:

میں نے اپنے لیے بھی کبھی کسی کے در پر حاضری نہیں دی اور میرا خیال ہے کہ اگر تمھارے لیے یہ کام کر گزروں گا تو یقیناً یہ تمھارے ساتھ ناانصافی ہوگی... پھل کو سیدھا پیڑ سے توڑ لینے میں بڑا لطف ہے .... میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ اس آسودگی سے تم محروم رہو۔ (خط مورخہ 11 جولائی 1956)۔

بلراج نے فن کار کے طور پر اپنی سالمیت کو برقرار رکھ کر، کڑی محنت کے ذریعہ فلمی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ یہاں تک کہ ایک دور وہ بھی آیا جب ان کی فلمیں کھچا کھچ بھرے ہوئے سینما ہالوں میں چلنے لگیں، جوبلیاں منانے لگیں، ایوارڈ برسنے لگے۔ بلراج کو پہچانا اور سراہا جانے لگا اور اس کے ساتھ ہی شہرت اور دولت ان کے قدم چومنے لگی۔ فلمی زندگی کے معمول کے اُتار چڑھاؤ کے باوجود ان کا ستارہ، عروج کی طرف ہی بڑھتا رہا۔ بمبئی میں ان کے گھر پر جو بھی جاتا، ان درجنوں ٹرافیوں کو دیکھ کر متاثر اور مرعوب ہوئے بغیر نہ رہتا جو ان کی بیسیوں ہٹ فلموں کی جوبلی کی یادگار تھیں۔ ان کے علاوہ فریم کیے ہوئے سپاس نامے بھی ہر طرف نظر آتے تھے جو ملک بھر کی کتنی ہی سوسائٹیوں اور حلقوں نے انھیں پیش کیے تھے۔

1969 میں انھیں بھارت سرکار کی طرف سے انھیں 'پدم شری' کا اعزاز بھی عطا کیا گیا۔

فلموں کے ساتھ بلراج نے اسٹیج سے بھی اپنا جیتا جاگتا رشتہ قائم رکھا۔ 1950 کے لگ بھگ آکر بمبئی میں اپٹا کی سرگرمیاں عملاً نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھیں۔ اس زمانے میں بلراج نے اپنے کچھ قریبی دوستوں اور ڈرامے کے جوشیلے پرستاروں کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا ڈراما گروپ شوقیہ بنیاد پر منظم کیا۔ 'جوہو آرٹ تھیٹر' اس گروپ کا نام رکھا گیا۔ اس میں بلراج کے علاوہ ان کی بیوی سنتوش، نتن سیٹھی، موہن شرما، ان کی باصلاحیت بیویاں اور دوسرے کئی فن کار شامل تھے۔ اس طرح بلراج کی ڈرامائی مصروفیتیں تقریباً کسی تعطل کے وقفے کے بغیر ہی جاری رہیں۔ ان لوگوں نے مل کر گوگول کا "انسپکٹر جنرل" اس کے بعد 'آذر کا خواب' (جو شا کے ڈرامے "PYGMALION" پر مبنی تھا)،

اوران کے علاوہ کئی دوسرے ڈرامے اسٹیج پر پیش کیے۔ بلراج کے اسٹیج کے ساتھی ڈراما آرٹسٹ بھی بلراج کے زیادہ گہرے اور عزیز دوست بن گئے اور بلراج کی بعد کی زندگی کی کتنی ہی دشوار گھڑیوں میں انھوں نے بلراج کا ساتھ دیا۔

1950 کی دھائی میں اپٹا کی سرگرمیوں میں پھر جان پڑنے لگی اور بلراج بھی دوبارہ اپٹا کے اسٹیج پر نظر آنے لگے۔ "آخری شمع" میں غالب کے رول میں انھوں نے یادگار قسم کی اداکاری کی۔ اس ڈرامے کے مکالمے کیفی اعظمی نے لکھے تھے اور ہدایت کار ایم۔ ایس۔ ستھیو تھے۔ غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر یہ ڈراما دہلی کے لال قلعہ کے دیوانِ عام میں پیش کیا گیا تھا اور بہت کامیاب رہا تھا۔

پنجابی اسٹیج سے بھی بلراج نے قریبی تعلق استوار کر رکھا تھا۔ وہ پنجابی کلا کیندر کے ڈراموں میں سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے۔ اس ڈراما گروپ کے کرتا دھرتا سردار گرچرن سنگھ تھے، جو خود بھی گہری سماجی وابستگی اور لگن رکھنے والے فن کار تھے۔ ان پنجابی ڈراموں میں حصّہ لینے کی خاطر بلراج کبھی کبھی بمبئی سے امرتسر تک کا طویل فاصلہ بھی ہنسی خوشی طے کر ڈالتے تھے، ڈراما گروپ کے ساتھ پنجاب کے اندرونی علاقوں کے دورے پر بھی نکل جاتے تھے۔ پنجابی اسٹیج سے ان کا یہ رشتہ ان کی زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرنے سے کوئی ہفتہ بھر پہلے تک بھی وہ بمبئی میں بلونت گارگی کے ایک ڈرامے کی تیاری میں مصروف رہے تھے۔

7

تخلیقی نگارشات

وقت گزرتا گیا۔ فلم آرٹسٹ کی حیثیت سے بلراج کی صلاحیتیں پھلتی پھولتی رہیں، بروئے کار آتی رہیں، نقش جماتی رہیں۔ اس کے ساتھ ہی دھیرے دھیرے ایک نئی دیوانگی ان پر چھاتی گئی۔ دراصل یہ جنون نیا نہ تھا۔ یہ تو شروع سے ہی ان کے ساتھ رہا تھا۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ پہلے یہ سویا ہوا تھا، اب جاگ اُٹھا، اور پوری توانائی کے ساتھ جاگ اُٹھا۔ یہ عشق کا جنون تھا — پنجابی زبان سے عشق، پنجابی ادب سے عشق، پنجابی کلچر سے عشق۔ اب اگر اس عشق نے ایسے زور و قوت اور جوش و خروش کے ساتھ اپنا جلوہ دکھایا تھا جس سے خود بلراج بھی غالباً بے خبر رہے ہوں گے۔ اس طوفانی عشق کے کئی اسباب تھے۔ بلراج بہت مدت پہلے پنجاب کو چھوڑ چکے تھے۔ وطن کی ہڑک انھیں بُری طرح ستاتی تھی۔ اپنے دیس میں واپس پہنچنے کی آرزو انھیں بے قرار رکھتی تھی۔ لیکن یہ محض یادِ وطن کی اداسی نہ تھی، یہ تو فن کار کے طور پر ان کی جدوجہد کا منطقی نتیجہ تھی۔ فن کار کی حیثیت سے وہ اس رمز کو سمجھ چکے تھے کہ انھیں اپنی جڑیں اپنے ہی خطّے کے عوام کے کلچر سے پیوست رکھنا ہیں، وابستگی اور لگاؤ کے احساس سے سرشار رہنا ہے، فن کار کے طور پر ان ہی لوگوں کی زندگی اور کلچر سے قوت حاصل کرنا ہے جن کے درمیان سے اُٹھ کر وہ آتے ہیں۔ اگر فن کار ایسی جڑوں سے محروم رہتا ہے تو اس کا فن مرجھا جاتا ہے یا کم از کم اس حشر کو تو پہنچتا ہی ہے کہ مشینی اور سطحی بن کر رہ جاتا ہے۔

اس عشق کے پسِ پردہ دوسرے عوامل بھی کار فرما تھے۔ ادب سے انھیں دیرینہ لگاؤ رہا تھا ایک لحاظ سے یہ ان کی پہلی محبت تھی، اور اب یہ محبت زور و شور کے ساتھ پلٹ آئی تھی اور اپنے وجود کو منوانے پر تُلی ہوئی تھی۔ اس احساس نے بھی ان کا دامن ابھی تک نہیں چھوڑا تھا کہ انھوں نے زندگی میں اس مشغلے کو نہیں اپنایا ہے جس کے لیے وہ بنے تھے اور انھیں اب تو ادب کی طرف لوٹ ہی جانا چاہیئے۔ اس کے ساتھ جس قبیل کی فلمیں بن رہی تھیں، ان کے خلاف بے اطمینانی کی لہر بھی بلراج کے دل میں زور پکڑتی جا رہی تھی۔ یہ اذیت ناک احساس انھیں بہت تڑپاتا تھا کہ فلمیں

بنانے میں جتنا وقت اور جتنی قوت صرف ہوتی ہے، فلموں کا معیار اس کا ہم پلہ ہرگز نہیں ہے۔
اس عشق کی شہ پر 1954 کے موسم گرما میں "بدنام" کی شوٹنگ کے بعد منالی سے واپس آتے ہوئے بلراج ہمیں امرتسر کا رُخ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہاں انھیں مشہور پنجابی ناول نگار نانک سنگھ کے درشن کرنے ہیں۔ مجھے وہ اس سے پہلے ہی (1953 پنجابی میں گُرمکھی رسم الخط میں خطوط لکھنے لگے تھے) ایک خط (مورخہ 12 مئی 1955) میں انھوں نے لکھا تھا:

فلموں سے مجھے ذرّہ برابر بھی لگاؤ نہیں ہے۔ میری لگن کا مرکز تو ادب ہے، اور اس میں بھی سب سے بڑھ کر پنجابی ادب۔ اگر میں کسی وجہ سے پنجابی میں طبع زاد تخلیقی کام نہیں کرسکتا تو کم از کم پنجابی میں ترجمہ تو کر ہی سکتا ہوں۔ اس طرح بھی زندگی بہر حال کارآمد اور بامقصد انداز سے گزرے گی .... لوگوں کو بہترین علم ان کی اپنی زبان میں درکار ہے۔ ملک کو آگے بڑھانے کا واحد حقیقی راستہ یہی ہے ....

اپنے خطوں میں اس خواہش کا اظہار انھوں نے بار بار کیا تھا کہ کچھ رقم پس انداز کرنے کے بعد وہ دہلی واپس چلے جائیں گے اور دہلی یا سری نگر میں رہنے لگیں گے۔ وہاں وہ اپنی ساری توانائی کو تخلیقی نگارشات کے لیے وقف کر دیں گے۔

تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ امیہ چکرورتی نے اپنی اگلی فلم کے لیے مجھے پھر لے لیا ہے۔ اس مرتبہ ہیروئن وجینتی مالا ہوگی۔ اس معاہدے کی وجہ سے عین ممکن ہے کچھ اور معاہدے بھی ہاتھ لگ جائیں۔ اگر اس برس میں کچھ اور رقم پس انداز کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اگلے سال تک میرا اس دلدل سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا ارادہ ہے ....

(خط مورخہ 20 فروری 1956)

کافی عرصے تک وہ اپنے وطن کو لوٹنے (اور ان ہی کے لفظوں میں) اپنا الگ "شانتی نکیتن" بسانے کے خواب دیکھتے رہے۔ "شانتی نکیتن" ان کے تصور کے مطابق ایک ایسا کنجِ عافیت ہوتا جہاں وہ اور میں اور کچھ دوسرے ہم خیال لوگ سادہ زندگی گزارتے اور اپنا سارا وقت ادبی مصروفیتوں کی نذر کرتے۔

آج کل دن رات شوٹنگ چل رہی ہے۔ بینک میں میرے نام سات آٹھ ہزار روپے جمع ہوگئے ہیں .... اب تو یہی خواہش ہے کہ اگلے چھ مہینے یا ایک سال کے اندر میرے پاس بیس ہزار روپے کی بچت ہوجائے۔ ایسی صورت میں اپنی زندگی پر میں صرف اپنا

حق سمجھنے کے قابل ہو سکوں گا۔ اگر اتفاق سے میں تیس ہزار روپے بچا لینے میں کام یاب ہو گیا تو پھر میں تمھیں بھی اپنے ساتھ کھینچ لاؤں گا اور ہم کشمیر میں اپنا الگ شانتی نکیتن بسائیں گے۔

چند مہینے بعد انھوں نے پھر لکھا:

اب میری حالت ایسی ہو گئی ہے کہ اس برس بیس ہزار روپے کی بچت کر لینا میرے لیے دشوار نہ ہو گا . . . . رہنے کے لیے دہلی اور کشمیر میں مفت کا مکان میسر ہے ہی۔ ان ساری باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تم منصوبہ بنا ہی ڈالو۔ اس سے بڑی خوشی مجھے دنیا کی کوئی بات نہیں بخش سکتی کہ ہم دونوں مل کر اپنا "شانتی نکیتن" بنائیں۔ فی الحال ہماری زندگی کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جسے ہم اپنا نہیں کہہ سکتے۔ تخلیقی کام کی راہ میں یہ بلاشبہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ لیکن اگر ہم مل بیٹھیں تو سوچ بچار کر کے اس کا بھی حل نکال سکتے ہیں، اگرچہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس راہ میں کتنی دشواریاں ہیں۔ (خط مورخہ مئی 1955)

یہی وہ دن تھے جب بلراج کی اداکارانہ صلاحیتیں روز بروز زیادہ پہچانی اور تسلیم کی جا رہی تھیں، جس کی وجہ سے وہ اس 'دلدل' میں زیادہ گہرائی تک دھنستے جا رہے تھے جس سے وہ بیزار رہتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ ادب کی تخلیق کو کل وقتی مشغلہ بنانے کا بلراج کا ارمان کہیں ویسا ہی تو نہیں ہے جیسے پتا جی پر بڑھاپے میں بزنس کی ہڑک پھر سوار رہنے لگی تھی — یعنی ایک ایسی منزل جس تک پہنچنے کی انھیں دلی آرزو تھی، مگر جس کے لیے وہ کڑی محنت اور ایثار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن حقیقت میں بلراج کے ساتھ یہ معاملہ نہ تھا۔ وہ تو سچ مچ کئی کئی گھنٹے پنجابی زبان کی تحصیل کے لیے وقف کرنے لگے تھے، اور وہ بھی اتنے جوش و خروش اور ذوق و شوق کے ساتھ کہ دیکھ کر رشک آتا تھا۔ پڑھنے کے علاوہ فقروں، محاوروں اور کہاوتوں سے کاپیاں بھرتے چلے جاتے تھے، ماں کے پاس بیٹھ جاتے تھے اور ان کی زبان سے نکلنے والے جملوں کو قلم بند کرتے رہتے تھے، گوردوارے پہنچ جاتے تھے اور وہاں گرو گرنتھ صاحب کا پاٹھ اور 'راگیوں' کے گائے ہوئے بھجن سنتے تھے۔ ایک رات کو جب میں بمبئی پہنچا ہوا تھا تو وہ مجھے ایک دور افتادہ گردوارے میں لے گئے، صرف اس لیے کہ وہاں پنجاب سے کچھ 'راگی' بھجن گانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ہم رات کے گیارہ بجے تک وہاں بیٹھے 'راگ' سنتے رہے۔ اس کے بعد بلراج نے تو اسٹوڈیو کا رُخ کیا جہاں انھیں ساری رات شوٹنگ کرنا تھی اور میں گھر لوٹ گیا۔

یہ صرف وطن کی ہڑک کا معاملہ نہ تھا۔ بنیادی طور پر تو ایک فن کار کی حیثیت سے انھوں نے اپنی زبان اور اپنے خطے کے کلچر کی طرف رجوع کیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پنجابی کلچر سے الگ تھلگ، اُکھڑا اُکھڑا محسوس کرنے لگے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ فن صرف اپنی ہی فضا میں پنپ سکتا ہے، کہیں اور نہیں۔ وہ بنگالیوں، ملیالیوں اور مہاراشٹریوں وغیرہ کی مثال گناتے تھے، جو ثقافتی اعتبار سے یک رنگ ہیں۔ انھیں پنجابیوں سے سخت شکایت تھی جو خود ہی اپنی زبان اور کلچر کا احترام کرنے کی جگہ اس سے تغافل برتتے ہیں۔ جب برطانویوں کا یہاں راج تھا تو سب سے ممتاز مقام انگریزی کو حاصل تھا۔ اس کے بعد اردو کی باری آتی تھی۔ آزادی کے بعد جب پنجاب میں اردو کا سماجی رُتبہ گھٹ گیا اور ہندی کا رُتبہ بڑھ گیا تو بہت سے پنجابی ادیب ہندی کی طرف پلٹ گئے۔ اس طرح پنجابی زبان کو خود پنجابی ہی نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ کیا یہ انوکھا ماجرا نہیں ہے؟ کسی بھی دوسری ریاست کے باشندے اپنی زبان کی اتنی کم پاس داری نہیں کرتے جتنی پنجابی کرتے رہے ہیں۔ بلراج کے خیال میں یہی وجہ ہے کہ اگرچہ بمبئی کی فلمی دنیا پر پنجابی چھائے ہوئے ہیں، مگر اس کے باوجود فلموں کا فن کارانہ اور ثقافتی معیار نہایت پست ہے۔

بلراج نے اپنے آپ کو پنجابی زبان اور کلچر سے جتنا قریبی طور پر وابستہ رکھا، اتنا ہی فلم آرٹسٹ کی حیثیت سے ان کی صلاحیتیں پھلتی پھولتی گئیں۔

پنجاب میں ان کے دَوروں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ چند ہی برس میں بہت سے پنجابی ادیبوں سے ان کے دوستانہ مراسم ہوگئے۔ ان کے حلقۂ احباب میں نانک سنگھ، گوربخش سنگھ، نوتیج، جسونت سنگھ کنول اور دوسرے ادیب شامل تھے، جن کے ساتھ ان کا ذاتی سطح پر بھی گہری دوستی کا رشتہ تھا۔ ادبی شخصیتیں اور مقامات جن کا تعلق ادبی شخصیتوں سے تھا، بلراج کو ہمیشہ مسحور کرتے رہے تھے۔ ادیبوں اور فن کاروں سے ملنے کا شوق انھیں جنون کی حد تک تھا۔ جب کبھی کوئی نظم انھیں متاثر کرتی، ان کے دل میں فوراً یہ خواہش جاگتی کہ اس نظم کے خالق سے جاکر ملیں۔ 1960 میں جب وہ پاکستان گئے تو پنجابی رومانی داستان "ہیر رانجھا" کی ہیروئن ہیر کے مزار پر انھوں نے بطور خاص حاضری دی، اگرچہ وہ جگہ دور افتادہ اور الگ تھلگ سی تھی۔ اسی طرح جب دلی جانا ہوتا تو غالب کے مزار پر اکثر حاضری دیا کرتے۔ برسوں پہلے وادیٔ کشمیر کے اندرونی علاقے کے ایک دور افتادہ گاؤں میں بھی انھیں یہی شوق کشاں کشاں لے گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے نامور کشمیری شاعر مہجور سے ملاقات کی سعادت حاصل کی تھی۔

جلد ہی انھوں نے ایک پنجابی ٹائپ رائٹر بھی خرید ڈالا۔ (یہ ریمنگٹن کا آفس ماڈل تھا)۔ بڑی

لگن کے ساتھ انھوں نے اس پیڈ ٹائپ کرنا سیکھا۔ پھر تو ایک دور وہ آیا جب وہ اسٹوڈیو میں ٹائپ رائٹر اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ شوٹنگ کے درمیانی وقفوں میں وہ اپنے کیبن میں بند ہو جاتے اور ٹک ٹک کرتے رہتے۔ اس طرح کبھی کوئی مضمون جنم لیتا، کبھی مقالہ، کبھی نظم۔

ان کا وطن واپس جا کر اپنا الگ "شانتی نکیتن" بسانے کا سپنا پورا ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ فلموں میں روز بروز پہلے سے زیادہ الجھتے جا رہے تھے۔ دوسرے امور بھی اس سپنے کو حقیقت میں بدلنے کی راہ میں مانع رہے۔ میرے نام 1960 میں لکھے ہوئے ایک خط میں انھوں نے ان رکاوٹوں کی وضاحت کی تھی:

مکان کی تعمیر کو میں نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ یہاں رہنے کے لیے کوئی اپنا ٹھکانا تو ہونا ہی چاہیے۔ خاص طور سے اس لیے کہ پریکشت بھی اسی پیشے کی ٹریننگ لے رہا ہے جس میں خود میں ہوں۔ اور پھر شبنم اور صنوبر بھی یہیں (بمبئی میں) پلی بڑھی ہیں۔ مکان بن جائے تو میں اپنے آپ کو زیادہ آزاد محسوس کروں گا۔ اگر بعد میں یہی طے ہوا کہ مجھے بمبئی کو چھوڑنا ہے تو مکان کو بیچا بھی جا سکتا ہے۔ کرایے پر بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ بلاشبہ میرا جھکاؤ پنجاب اور پنجابی ادب کی طرف ہی زیادہ ہے اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ ان ہی میں کھو کر رہ جاؤں۔

افسوس، جب وہ پنجاب جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جب پریت نگر میں ایک مکان خرید کر سارے لوازم سے لیس کر لیا گیا۔ جب انھوں نے اپنی فلمی مصروفیتیں گھٹاتے گھٹاتے برائے نام کر لیں۔ جب ان کے لیے پنجاب جا کر وہاں بس جانا صرف چند دن کا معاملہ رہ گیا، تو موت کا فرشتہ انھیں لے اڑا۔

تاہم اپنے رول میں بلراج نے اپنا "شانتی نکیتن" اپنا چھوٹا سا پنجاب پہلے ہی بسا رکھا تھا۔ پنجابی کلچر کا وہ چھوٹا سا گھر ان کے دل میں ہر وقت آباد رہتا تھا جس سے انھیں فلم آرٹسٹ اور قلم کار، دونوں حیثیتوں سے قوت اور غذا اور امنگ ملتی تھی۔

وہ اس نکتے کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے جو 1930 کی دہائی کے آخر میں آچاریہ شتی موہن سین نے شانتی نکیتن میں ان کے روبرو بیان کیا تھا:

طوائف دولت، شہرت، عیش و آرام، سب کچھ پا سکتی ہے، لیکن وہ بیوی کا رتبہ کبھی حاصل نہیں کر سکتی۔ اظہار کے بیرونی وسیلے کا بھی یہی حال ہے۔

ایک اور جگہ، اپنی فلمی زندگی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

مارکس واد نے مجھے زبان کے مسئلے کا سائنٹفک ڈھنگ سے جائزہ لینا سکھایا ہے۔ ٹیگور اور گاندھی جیسی عظیم شخصیتوں کے افکار سے متاثر ہوکر خود میں بھی اس تصوّر کا پہلے ہی حامی بن چلا تھا کہ ہر فن کار اور ہر ادیب کے لیے اظہارِ ذات کا بہترین وسیلہ اس کی مادری زبان ہی ہے۔ اب مارکس واد کے مطالعہ نے میرے اس یقین کو اور بھی مستحکم کر دیا ہے۔ (' میری فلمی آتم کتھا ' : صفحہ 108)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ بلراج نے پنجابی زبان کے مطالعہ میں اپنے آپ کو اس طرح غرق کر رکھا تھا کہ دوسری زبانوں کو بالکل ہی فراموش اور نظرانداز کر بیٹھے تھے۔ وہ ادب کے شیدائی تھے اور ان کی نظر میں دوسری زبانوں کی بھی اتنی ہی اہمیت اور وقعت تھی جتنی پنجابی کی۔ اس لیے وہ بساط بھر دوسری زبانوں کی تحصیل کی کوشش میں بھی لگے رہتے تھے۔ جب وہ انگلستان میں تھے تو بہت محنت کرکے انھوں نے اپنے اردو کے علم کو سنوارا تھا، تاکہ غالب کی شاعری کو پڑھ سکیں، سمجھ سکیں، سراہ سکیں۔ غالب کے تو وہ جی جان سے عاشق تھے۔ چنانچہ غالب کے کلام کو ایک ساتھ بیٹھ کر پڑھنے اور بحث کرنے میں ہم نے نہ جانے کتنی خوش گوار گھڑیاں گزاری ہوں گی۔ انھیں بنگالی زبان پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ ٹیگور کا تقریباً سارا کلام انھوں نے بنگالی میں ہی پڑھا تھا۔ ایک بار وہ دہلی سے گزر رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر میری ان سے ملاقات ہوئی۔ فوراً ہی وہ بنگالی میں ٹیگور کی ایک طویل نظم سنانے لگے، جو وہ پہلے سے ہی پڑھتے آ رہے تھے۔ اس نظم کے باب میں ان کا جوش اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ جب تک ٹرین پلیٹ فارم سے آگے نہ بڑھ گئی اور ان کا سفر پھر شروع نہ ہوگیا، انھوں نے اور کوئی بات ہی نہیں کی۔ (یہ نظم "مہابھارت" کے دو کرداروں کے درمیان مکالموں پر مشتمل تھی)۔ جب وہ بمبئی میں تھے تو انھوں نے گجراتی اور مراٹھی، دونوں زبانیں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ سیکھی تھیں۔ ایک موقع پر میں نے انھیں تمل زبان کے مطالعہ میں بھی مصروف پایا۔ زبانیں سیکھنے کے معاملے میں وہ واقعی تیز تھے اور انھیں صحت کے ساتھ استعمال کرنے پر بھی انھیں کافی قدرت حاصل تھی۔

1960 میں بلراج نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اس سفر کے لیے ان کے دل میں بے انتہا شوق اور ولولہ تھا۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ راولپنڈی سے، جہاں ہمارا گھر تھا، ان کی قریبی وابستگی بھیرا سے، جو ہمارا آبائی وطن تھا، ان کا جذباتی لگاؤ لاہور سے جہاں انھوں نے اعلا تعلیم حاصل کی اور جہاں بعد میں انھوں نے عملی زندگی کے میدان میں پہلا قدم رکھا، لیکن ان ذاتی وابستگیوں سے قطع نظر، وہ ایک اعتبار سے یک فردی خیرسگالی مشن پر پاکستان گئے تھے، کیوں کہ پاکستان کے عوام کے لیے

ان کے دل میں بے پناہ محبت اور احترام تھا۔ پاکستان سے واپسی پر انھوں نے اپنا مشہور سفرنامہ "میرا پاکستانی سفر" لکھا جو پنجابی میں ان کی پہلی بڑی تصنیف تھی۔

اس کتاب کے پشت کے سرِ ورق پر بلراج اپنے لڑکپن کے دوست اور پڑوسی بوستان خان سے بغل گیر نظر آتے ہیں۔ اپنے پرانے ساتھیوں سے مل کر انھیں سچ مچ سنسنی بھری خوشی حاصل ہوئی تھی ان میں سے ایک اب تانگہ چلاتا تھا، دوسرا کار ڈرائیور بن گیا تھا، تیسرا تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھا۔ اسی طرح ان کے بچپن کے دیگر ساتھی بھی انھیں الگ الگ حال میں ملے۔ جب انھوں نے اپنے خطے کی میٹھی، شہد بھری پوٹھوہاری زبان سنی تو ان کی رگ رگ میں سرور کی لہر دوڑ گئی۔ بھیرا میں ان کی ملاقات ایک بوڑھی عورت سے ہوئی جو ہمارے ماں باپ اور کئی دوسرے رشتہ داروں سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ ان کے سامنے بیتے دنوں کی یادیں تازہ کرتی رہی اور ان سے اس طرح پیش آئی جیسے بہت عرصے کے بعد ماں نے بیٹے کو دیکھا ہو۔ بلراج سرگودھا ضلع کے ایک چھوٹے سے قصبے جھنگ میں بھی گئے اور وہاں عظیم پنجابی رومان کی ہیروئن ہیر کے مزار پر حاضری دی۔ یہ دورہ انھوں نے قطعی جذباتی سطح پر کیا تھا۔ ایک چھوٹا سا واقعہ بلراج کے اندازِ نظر کی وضاحت کرنے کے لیے کافی ہے۔

راولپنڈی میں بلراج چھاچی محلے میں اپنے پرانے مکان کو ایک نظر دیکھنے کے لیے گئے۔ برِصغیر کے بٹوارے سے لے کر اُس وقت تک ہمیں کچھ بھی علم نہ تھا کہ ہمارے مکان کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ صرف ایک خط ہمارے ایک پڑوسی کی طرف سے آیا تھا جس میں انھوں نے اطلاع دی تھی کہ ہمارے رخصت ہونے کے کچھ دیر بعد ہی مکان کے سامنے کے دروازے کا تالا توڑ دیا گیا تھا اور لوگ بہت سا سامان وہاں سے اُٹھا کر لے گئے تھے۔ اس طرح کے واقعات پنجاب کی سرحد کے دونوں طرف عام طور سے ہوتے رہتے تھے اور تارکینِ وطن انھیں معمول کی بات سمجھ کر چپ ہو جاتے تھے۔ لیکن پھر بھی ان لوگوں کے بارے میں ہمیں ضرور تجسس تھا جو ہمارے مکان میں اب رہ رہے تھے۔

جب بلراج اپنے پرانے مکان تک پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں تو شادی کی دھوم دھام ہے۔ برات کی تواضع کے لیے دعوت کا اہتمام ہو رہا تھا۔ بلراج نے مکان کے موجودہ مکینوں سے اپنا تعارف کرایا۔ یہ لوگ متوسط طبقے کے مسلمان تھے اور مشرقی پنجاب سے اُجڑ کر وہاں آ بسے تھے۔ اور پھر جلد ہی اِس خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بلراج بھی براتیوں کو کھانا پروستے ہوئے نظر آنے لگے!

یہ کتاب خلوص اور انسانیت کی حرارت سے معمور دستاویز ہے۔ اس سے یہ بھی انکشاف

ہوتا ہے کہ جو دھاگے ہمیں پاکستان کے عوام اور پاکستان کے کلچر سے باندھے ہوئے ہیں وہ بہت نازک اور نظر نہ آنے کی حد تک باریک ہیں، اور اس کے باوجود فولاد کی طرح مضبوط بھی ہیں۔ اس کتاب کی سب ہی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ ہندی اور اردو، دونوں زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

پنجابی ادب کے میدان میں یہ بلراج کا پہلا بڑا قدم تھا۔

اس کے بعد بلراج پابندی سے، کافی بے جھجک ہو کر برابر لکھتے رہے۔ زبان اور رسم الخط کو سیکھنے کا ابتدائی، پُرمشقت دور اب تمام ہو چکا تھا۔ ان کی خود اعتمادی بڑھتی گئی، تحریریں زیادہ روانی آتی گئی۔ کسی ارادی کوشش کے بغیر جتنی آسانی اور بے تکلفی سے اب وہ پنجابی میں اپنی بات بیان کر سکتے تھے، اس کا ذکر انھوں نے جا بجا کیا ہے: "پہلے نظمیں لکھتے وقت مجھے بڑی جھجک ہوتی تھی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ مضامین، یادیں، شاعری، کچھ بھی قلم برداشتہ لکھ ڈالتا ہوں۔ اظہارِ ذات کے ضمن میں زبان اب میرے لیے ذرا بھی رُکاوٹ نہیں رہی ہے۔ اپنے مزاج کے موافق سارے عناصر مجھے مل گئے ہیں اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ بیان پر مجھے پوری قدرت حاصل ہو گئی ہے۔"

اس کا مطلب یہ نہیں کہ بلراج کسی بے جا زعم میں مبتلا ہو گئے تھے اور خود تنقیدی کے عمل کو نظر انداز کر چکے تھے۔ وہ اکثر شاکی رہتے تھے کہ مختصر افسانے لکھنے کا گُر وہ بھول گئے ہیں، یا یہ کہ ان کی شاعری میں ابھی تک طمطراق کا رنگ ہے۔ لیکن اس باب میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ادیب کے طور پر وہ برابر اپنے لیے مستحکم بنیادیں دریافت کر رہے تھے۔ ہفت روزہ "رنجیت" (بمبئی) میں کتابوں پر ان کے تبصرے باقاعدگی کے ساتھ چھپتے تھے۔ پنجاب میں "پریت لڑی" اور دہلی میں "آرسی" کو اپنے مضامین، نظمیں وغیرہ پابندی سے بھیجتے رہتے تھے۔ بلراج کے عملی تعاون سے بمبئی کی لکھاری سبھا نے پنجابی لکھنے والوں کی ایک کانفرنس بھی بمبئی میں منعقد کی تھی۔

"میرا پاکستانی سفر" کے بعد 1969 میں بلراج کا ایک اور قابلِ ذکر سیاحت نامہ "میرا روسی سفرنامہ" شائع ہوا۔ اس سیاحت نامہ میں سوویت یونین کے کچھ حصوں کی تین ہفتے کی سیاحت کی روداد بیان کی گئی ہے۔ بلراج نے یہ دورہ گیانی ذیل سنگھ اور جنوبی ہندوستان کے ایک اور دوست کی معیت میں کیا تھا۔ اس عظیم ملک کا یہ بلراج کا پہلا دورہ نہ تھا۔ پہلی بار وہ 1954 میں ایک فلمی وفد کے رکن کی حیثیت سے ہندوستانی فلموں کے میلے میں شرکت کرنے کے لیے سوویت یونین گئے تھے۔ اس میلے میں "دو بیگھہ زمین"، "آوارہ" اور کچھ دوسری ہندوستانی فلمیں دکھائی

گئی تھیں - واپسی پر بلراج کے جوش کا عجیب عالم تھا۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا تھا: "واہ! کیا ملک ہے! کیا لوگ ہیں! کیا زندگی ہے!" اس کے بعد سوویئت یونین سے ان کا لگاؤ بڑھتا ہی گیا اور انھوں نے کئی مرتبہ وہاں کا سفر کیا ۔۔۔ کبھی کسی فلمی وفد کے رکن کے طور پر، کبھی ہند۔ سوویئت کلچرل سوسائٹی کی طرف سے بھیجے ہوئے ڈیلی گیشن کے ممبر کی حیثیت سے۔ ہند۔ سوویئت کلچرل سوسائٹی کے وہ ایک نائب صدر بھی تھے۔ سوویئت یونین میں "پردیسی" کی شوٹنگ کے سلسلے میں بھی ان کا قیام رہا۔ یہ فلم ہندوستانی اور سوویئت فلمی کارکنوں کے باہمی اشتراک سے بنی تھی۔ اس کا موضوع چودھویں صدی کے ایک روسی تاجر افاناسی نکیتن کی زندگی اور سیاحت تھی۔ بلراج نے اس فلم میں افاناسی کے دوست کا رول ادا کیا تھا۔

"میرا روسی سفرنامہ" روزمرّہ کے مشاہدات کی پُرلطف اور ولولہ انگیز روداد ہے۔ بیان میں بے تکلّف بات چیت کا انداز ہے۔ بیچ بیچ میں سنجیدہ غور و فکر اور تبصرے کی جھلکیاں بھی ہیں۔ اس کی ایک انتہائی دل کش خصوصیت یہ ہے کہ یہ لاگ لپیٹ سے دور ہے۔ اندازِ نظر معروضی ہے۔ بلراج نے اس بات کا خاص اہتمام رکھا ہے کہ ہر چیز اور ہر بات کو اسی روپ میں پیش کیا جائے جس روپ میں انھوں نے اسے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، برتا ہے، تجربہ کیا ہے۔

اس کتاب کو بہت سراہا گیا۔ علمی حلقوں میں اس نے خوب دھوم مچائی۔ اس کتاب کے لیے بلراج کو سوویئت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد بلراج نے ایک پمفلٹ لکھا، جس میں ملک کے مختلف حصّوں میں ترسیل کے مسئلے کو سہل بنانے کے لیے رومن رسم الخط اختیار کرنے کی پُرزور وکالت کی گئی تھی۔ یہ تجویز پیش کرنے میں انھیں اس حقیقت سے بھی شہ ملی کہ فوج میں ہدایات اور اطلاعات وغیرہ پہلے سے ہی رومن رسم الخط میں جاری کی جاتی رہی ہیں اور وہاں اس رسم الخط کی افادیت ثابت ہو چکی ہے۔ اگر سارے ہندوستان میں اسے اپنا لیا جائے تو اس ٹکراؤ سے بڑی حد تک نجات مل جائے گی جو مختلف ہندوستانی زبانوں کے رسوم الخط کی بحث و تکرار سے پیدا ہوتا ہے۔ بلراج نے یہ پمفلٹ اپنے ہی خرچ پر چھپوا کر اسے بڑے پیمانے پر دانشوروں اور عوامی زندگی کے مختلف شعبوں کے رہنماؤں تک پہنچایا تھا۔

1970 میں بلراج نے ایک اور پمفلٹ لکھا، جس کا عنوان تھا: "ہندی ادیبوں کے نام ایک خط"۔ یہ پمفلٹ اصلاً پنجابی میں لکھا گیا تھا اور بعد میں اس کا ترجمہ ہندی میں مشہور قلم کار سُکھ بیر نے کیا تھا۔ بلراج نے اسے اشاعت کے لیے "دھرم یگ" اور دوسرے سرکردہ ہندی

جریدوں کو بھیجا تھا، لیکن کوئی بھی جریدہ اسے شائع کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ انجام کار یہ 'خط' بھی 1972 میں پمفلٹ کے روپ میں بلراج کے خرچ پر چھپا اور مفت تقسیم ہوا۔

چونکہ بلراج نے اپنے کیریر کا آغاز ہندی قلم کار کے طور پر کیا تھا، اس لیے ان کا خیال تھا کہ ہندی ادیبوں کی توجہ حاصل کرنے کا انھیں پورا حق ہے۔ اسی لیے اس 'خط' میں انھوں نے ہندی ادیبوں کو براہِ راست مخاطب کیا تھا۔ حالیہ دور میں اردو کے سوال پر یہ 'خط' بلاشبہ ایک اہم تحریر ہے اور یقیناً اس قابل ہے کہ غور سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

'خط' کا آغاز بلراج نے بمبئی میں منعقد ہونے والی ایک اردو کنونشن پر نکتہ چینی سے کیا ہے انھیں شبہ تھا کہ یہ کنونشن اردو کو ایک اقلیتی زبان قرار دینے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کے ساتھ زبان کو جوڑنے کا سلسلہ برطانویوں نے شروع کیا تھا۔ مثال کے طور پر پنجاب کی زبان انھوں نے اردو ٹھیرائی، صرف اس لیے کہ پنجاب میں رہنے والوں کی اکثریت مسلمان تھی۔ اس طرح انگریزوں نے پورے ملک کی سماجی زندگی میں فرقہ پرستی کے زہریلے بیج بو دیے۔ اب اگر اردو کو ایک اقلیتی زبان قرار دینا بھی انگریزوں کی بنائی ہوئی سمت میں ایک قدم ہے۔

> زبان کو مذہب کے ساتھ جوڑنے کی مکروہ سامراجی سازش پر مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے کاری ضرب لگائی ہے۔ اردو کو اپنی زبان کی حیثیت سے مسترد کر کے بنگالی مسلمانوں نے اس دعوے کی دھجیاں اُڑا دی ہیں کہ اردو ایک اسلامی زبان ہے۔ اسی طرح تامل ناڈو کے ہندوؤں نے ہندی کو سارے ہندوؤں کی زبان نہ مان کر اس فرسودہ تصوّر پر مہلک وار کیا ہے کہ زبان کا مذہب کے ساتھ کوئی رشتہ ہو سکتا ہے۔

پھر آگے وہ لکھتے ہیں:

> ہمارا ملک بہت سی نسلوں اور قومیتوں کا ملا جلا کنبہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو برابر کے حقوق سے بہرہ ور ہونا چاہیے۔ جو لوگ بے سوچے سمجھے " ایک ملک، ایک زبان " کا نعرہ لگاتے پھرتے ہیں، انھیں پاکستان کے تجربے سے سبق سیکھنا چاہیے: یہ ایکتا کا نہیں، رجعت، زوال اور پس ماندگی کا راستہ ہے ....

تاریخ کے اوراق پلٹ کر بلراج ان علاقوں کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کا جائزہ لیتے ہیں جہاں سے ماضی میں حملہ آور قومیں ہندوستان آئی تھیں اور کہتے ہیں:

اسلام کے ظہور سے پہلے جو قومیں ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں ان کا تعلق اسی نسل سے تھا جس سے ہمارا تعلق تھا۔ اسی طرح اسلام کے ظہور کے بعد جن قوموں نے اسلام قبول کرنے کے بعد ہندوستان پر یلغار کی، ان کا بھی ہم سے یہی نسلی رشتہ تھا۔ وہی خون ان کی رگوں میں بھی دوڑ رہا تھا جو ہماری رگوں میں رواں تھا۔ یہاں تک کہ ان کی زبانیں بھی سنسکرت کے بطن سے نمودار ہوئی تھیں ....

اس کے بعد بلراج رسم الخط کے مسئلے پر آتے ہیں :

شمالی ہندوستان میں سیکڑوں برس سے فارسی رسم الخط مقامی تحریروں کے شانہ بہ شانہ استعمال ہوتا آیا ہے۔ اس صدیوں کے استعمال نے مغل لباس کی طرح فارسی رسم الخط کو بھی ہندوستانی شے بنا دیا ہے۔ کون جانتا ہے کہ مشہور پنجابی شاعر شیخ فرید نے اپنے اشعار فارسی رسم الخط میں تحریر کیے تھے یا گورمکھی رسم الخط میں ؟ کسے علم ہے کہ وارث شاہ نے مشہورِ زمانہ طویل رومانی نظم "ہیر رانجھا" کون سے رسم الخط میں لکھی تھی ؟ لیکن پنجابی کے لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں پنجابی زبان کے پرانے، تاریخی رسوم الخط ہیں .... اسی طرح آپ کی ریاست اُتر پردیش میں فارسی اور دیوناگری دونوں رسوم الخط دو بہنوں کی طرح پہلو بہ پہلو رہتے آئے ہیں۔ کسے پتہ ہے کہ امیر خسرو نے اپنے اشعار لکھتے وقت دیوناگری رسم الخط کو اپنایا تھا یا فارسی رسم الخط کو ؟ یا "پدماوت" کے مصنف ملک محمد جائسی نے کون سے رسم الخط کا انتخاب کیا تھا ؟ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ دونوں ہندی کے عظیم شاعر ہیں۔ وقت کے ساتھ اردو اعلیٰ طبقوں، شہر والوں اور درباریوں کی منظورِ نظر بنتی گئی، لیکن جن لوگوں نے اردو میں لکھا ان میں ہندو بھی شامل تھے، اور مسلمان بھی ....

دونوں رسم الخط کو اپنا کر ہندی اور اردو کو کسی بھی طرح کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔ اردو کو اس کے جائز حق سے محروم رکھ کر اُتر پردیش کے لوگوں نے خود اپنی سماجی اور ثقافتی نشو و نما پر ہی کاری وار کیا ہے ....

اس سے آگے بلراج کہتے ہیں :

جن علاقوں میں اردو مادری زبان نہیں ہے، وہاں اردو کے حقوق کو تسلیم کرانے کی کوشش کرنا گویا اردو کو صرف مسلم اقلیت کے ساتھ وابستہ کرنا ہے۔ اگر اردو پنجابیوں

یا بنگالیوں کی زبان نہیں ہے تو پھر یہ مراٹھوں کی، آندھرا باسیوں کی، تملیوں کی، ملیالیوں کی زبان بھی نہیں ہو سکتی، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ ان ریاستوں کے مسلمانوں کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کو اتنا ہی عزیز رکھیں جتنا بنگالی یا بنگلہ دیشی بنگالی زبان کو عزیز رکھتا ہے۔ البتہ اُتر پردیش میں اردو کو ضرور اس کا جائز حق ملنا چاہیے، کیوں کہ اس خطّے کی یہ مادری زبان ہے۔ بلاشک وشبہ اُتر پردیش میں اردو کو ہندی کے برابر ہی رُتبہ حاصل ہونا چاہیے۔ کوئی بھی منصف مزاج شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ ہندی اور اردو کو ایک دوسرے سے کوئی پُرخاش نہیں ہے۔ یہ ایک ہی زبان ہے جو دو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے —— بالکل پنجابی زبان کی طرح۔

بلراج کی دلیلوں میں وزن ہے، معقولیت ہے، منطقی ربط ہے۔ ان کے خیالات کے پسِ پشت یر خواہی کا پُرخلوص جذبہ کارفرما ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے سماج میں بنیادی اہمیت کے حامل مسئلوں پر عوامی نث کی حوصلہ افزائی کبھی نہیں کی جاتی۔ بس یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ان مسئلوں پر اظہارِ رائے کے اہل صرف رباب علم یا سیاست داں ہیں۔ فرقہ پرستانہ جذبات اس صورتِ حال کو مزید ابتر بنانے کا وسیلہ بن جاتے یں۔ یہ جذبات آسانی سے بھڑک بھی اُٹھتے ہیں اور مسئلوں پر قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے بےلاگ ہو کر، بذبات سے الگ ہٹ کر بحث کرنے کا باب بھی بند کر دیتے ہیں۔ بلراج حب وطن کے جوش سے سرشار ھے، اس لیے اس موضوع پر جس نے انھیں تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا، وہ بےجھجک اپنے خیالات کا اظہار کر گئے۔

تقریباً اسی زمانے میں بلراج نے پنجابی میں ایک تین ایکٹ کے ڈرامے پر کام شروع کر رکھا تھا۔ س ڈرامے پر انھوں نے بہت محنت کی۔ اس کے مسودے پر کئی بار نظرِ ثانی کی۔ ایک ایک ٹکڑے کو کئی ئی بار لکھا۔ اس کا عنوان تھا: "باپو کی کہے گا؟" (باپو کیا کہے گا؟)۔ یہ سماجی ڈراما ہے اور فینٹیسی کے وپ میں لکھا گیا ہے۔

ایک بےغرض سن رسیدہ سماجی کارکن، جو کانگریس کا مقامی لیڈر بھی رہ چکا ہے، ہسپتال میں خمی پڑا ہے۔ وہ اس فساد میں زخمی ہوا ہے جو اچانک شہر میں پھوٹ پڑا تھا۔ ہذیان کے عالم میں اسے سوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور پسِ زندگی کی سرحد کو پار کر کے مُردوں کے خطّے میں پہنچ گیا ہے۔ وہاں اندھی، نہرو، بھگت سنگھ اور دوسرے پُرانے قومی رہنماؤں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ ان عظیم رہنماؤں سے وہ کچھ ایسے سوال پوچھتا ہے جو اس کے لیے فکر اور تردّد کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ صحیح

جوابوں کے لیے اسے ان عظیم شخصیتوں کی مدد اس لیے درکار ہے کہ خود وہ عصری حقیقت کو ٹھیک ڈھنگ سے سمجھنے سے قاصر ہے۔

اس ڈرامے کو اسٹیج پر پیش ہوتے دیکھنا بلراج کے نصیب میں نہ تھا۔ پہلی مرتبہ اسے ممبئی کے اپٹا آرٹسٹوں نے دہلی میں بلراج کی پہلی برسی کے موقع پر اسٹیج کیا۔ ستھیو نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اسے ڈائریکٹ کیا تھا

بلراج کی ادبی پیداوار اس درمیان بڑھتی ہی جارہی تھی۔ ایک موقع پر تو وہ مضامین کے دو دو سلسلے بیک وقت شائع کرا رہے تھے۔ ایک سلسلہ فلمی دنیا میں ان کے تجربات کی روداد پر مشتمل تھا۔ یہ مضامین بعد میں مرتب ہو کر "میری فلمی سرگزشت" کے عنوان کے تحت کتابی صورت میں چھپے۔ دوسرے سلسلے کا تعلق ان کے عام تجربات سے تھا اس سلسلے کے مضامین میں مختلف افراد کے قلمی خاکے پیش کیے گئے تھے، جن میں زیادہ تر زندگی کے نچلے شعبوں سے متعلق تھے۔ یہ مضامین بھی "غیر جذباتی ڈائری" کے عنوان سے کتابی صورت میں مرتب اور شائع ہوئے۔ بلراج کے قلمی خاکے کیا ہیں، اصل افراد کی ہو بہو تصویریں ہیں ــــ صاف، واضح، اس گہری انسانی دردمندی سے رچی ہوئی، جو ادیب کے طور پر بلراج کی ایک غالب خصوصیت تھی۔ اور ان کی فلمی یادیں اس جدوجہد پر بھی نور کا ریلا ڈالتی ہیں جو فلم آرٹسٹ کے طور پر انھوں نے کی تھی اور فلم کے فن اور اس کے لازمی عناصر کے بہت سے پہلوؤں کو بھی روشن کر جاتی ہیں۔ ان یادوں میں بے باکی ہے، جرأت ہے، خلوص ہے۔ ان کے آئینے میں خود بلراج کی اندرونی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا انکسار، ان کا پذیرائی کرنے والا ذہن جو دوسروں کی فن کارانہ صلاحیتوں کو پرکھ سکتا ہے، سراہ سکتا ہے، ان کا متوازن سماجی تناظر، اور ان سب کے ساتھ اس میدان کی کیفیت اور احوال بھی جس میں وہ کام کر رہے تھے۔ ایک طرف یہ یادیں ٹھوس حقیقتوں کا ذخیرہ ہیں تو دوسری طرف ان حقائق کو ہماری سماجی زندگی اور اخلاقی اور جمالیاتی قدروں کے وسیع تر پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ بیان میں گپ شپ کا انداز ہے۔ دلچسپی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ فلمی شخصیتوں کے رنگ ڈھنگ، ایکسٹراؤں کی دنیا، اسٹوڈیو کے کام کی جھلکیاں، فلم نگری کے چٹپٹے واقعات ــــ ان سب کو سموئے ہوئے یہ یادیں ایک انتہائی پُراثر دستاویز بھی ہیں جس سے فلمی زندگی کی ستم ظریفیوں، اس کے تصوّر کو حقیقت سمجھنے کے وطیرے، اس کے دکھ درد کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

اس بیچ میں بلراج شاعری کی طرف سے بھی غافل نہ رہے۔ ان کی نظموں میں، جو زیادہ تر آزاد

روپ میں لکھی گئی ہیں، ایک طویل نظم " ویہڑ دی وار" (ویہڑ کا گیت) بھی شامل ہے۔ یہ نظم 1972 میں " پریت لڑی" میں چھپی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سی مختصر نظمیں بھی انھوں نے اسی دور میں لکھیں۔

بلراج ایک ناول پر بھی کام کر رہے تھے۔ اس کی منصوبہ بندی انھوں نے بہت بڑے کینوس پر کی تھی، مگر وہ اسے نامکمل ہی چھوڑ گئے۔ اس طرح ان کی ادبی کاوشوں میں دو سفرنامے، دو یادوں کی کتابیں، ایک بے طول کا ڈراما، بہت سی نظمیں، دو پمفلٹ، ایک کنووکیشن ایڈریس (جو انھوں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پڑھا تھا) اور کثیر تعداد میں مضامین، انشائیے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب کے سب پنجابی زبان میں لکھے گئے تھے۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں، جب وہ ہندی میں لکھ رہے تھے، " بسنت کیا کہے گا ؟ " کے عنوان سے ایک کہانیوں کا مجموعہ، ایک بچوں کی کتاب " ڈھیور سنگھ" اور بہت سے انشائیے اور فلمی خاکے ہمیں ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بلراج کی متعدد کاوشیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی میں چند نظمیں جو انھوں نے کالج کے دنوں میں لکھی تھیں، کچھ نظموں کے انگریزی تراجم، ایک ریڈیو ڈراما " وہ آدمی جس کے سر میں گھڑی تھی " جو انھوں نے اس زمانے میں لکھا تھا جب وہ لندن میں بی بی سی میں کام کر رہے تھے، ایک اسٹیج ڈراما " کرسی " جو انھوں نے اپٹا سے وابستگی کے دور میں سپردِ قلم کیا تھا، اور فلم " بازی " کا منظر نامہ۔

کل ملا کر یہ ذخیرہ بہت بڑا نہیں، لیکن اگر اسے ان کی بے انتہا مصروف زندگی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ بلاشبہ قابلِ لحاظ بھی ہے اور اہم بھی۔

اس میدان میں بھی بلراج کی صلاحیتوں کا اعتراف خوب ہوا۔ پنجاب سرکار کے زبانوں کے محکمے کی طرف سے انھیں 1971 میں ' لیکھک شرومنی ایوارڈ ' ملا۔ یہ اعزاز بلراج کو بہت عزیز تھا۔

ممتاز پنجابی ناقد سردار کپور سنگھ گمنام ' بلراج کی ادبی کاوشوں کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> بلراج کے بول دل کی گہرائی میں اُتر جاتے ہیں، کیوں کہ ان کا سرچشمہ ان کے اپنے تجربے، ان کے اپنے واردات ہیں۔ بلراج کی شخصیت ان کی تحریروں میں شیر و شکر کی طرح گھلی ملی رہتی ہے۔ ان کا ' روسی سفرنامہ ' پڑھ کر قاری یہی محسوس کرتا ہے کہ وہ خود بلراج کے روبرو کھڑا ہے اور ان کی باتیں سن رہا ہے۔ ان کی تحریروں میں ذاتی رنگ نمایاں رہتا ہے، چنانچہ ان کی تحریروں کے توسط سے قاری ان کے گھر کے ہر فرد سے متعارف ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر اسے خود بلراج کی شفاف

روح کی صاف اور واضح جھلک نظر آتی ہے۔ بلراج طنز کے تیر اور مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑنے میں اتنی ہی مہارت رکھتے ہیں جتنی منطقی استدلال کے استعمال میں۔ کبھی کبھی وہ دقیق علمی، سماجی اور فلسفیانہ مسائل کی شرح کے لیے مکالموں کی ٹیکنیک کا سہارا لیتے ہیں، جو بہت اثر آفریں ثابت ہوتی ہے۔ بلراج اپنے دلائل پر جذبات کو کبھی غالب نہیں آنے دیتے۔ یہی سبب ہے کہ اپنے اسلوب پر بنیادی طور پر عقل استدلال چھایا رہتا ہے۔ یہ قاری کی قوتِ استدلال کو بھی اُبھارتا اور شہ دیتا ہے۔ بلراج کا گہرا مطالعہ انھیں مختلف موضوعات پر مربوط اور منطقی دلائل کے ساتھ بحث کرنے میں مدد دیتا ہے، جب کہ ان کے اندر کا فن کار تماشائی اور قاری کی دلچسپی کو مسلسل قائم رکھتا ہے۔ ایک باکمال اداکار ہونے کے باعث وہ کسی لمحے کی شدت کو بھی بڑے ہلکے پھلکے ڈھنگ سے، کبھی کبھی محض ایک سادہ سے اشارے سے، دوسروں تک منتقل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس میں حقیقت اور سچائی ہوتی ہے، بے باکی، آمد اور خلوص کا رنگ ہوتا ہے، بے لاگ نظر اور نیک نیتی ہوتی ہے۔ یہی ان کے قلم کے جادو کا راز ہے۔ بلاشبہ بلراج ایک اچھے ادیب تھے، اور یہی حقیقت ان کے عظیم اداکار بننے میں بھی معاون بنی۔

بلراج جب دوستوں سے باتیں کرتے تھے تو ضبط اور شیرینی ان باتوں میں رچی رہتی تھی۔ یہی خصوصیت ان کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔ وہ کسی بھی جگہ ایک بھی جملہ فاضل نہیں لکھتے۔

بلراج صداقت کے پرستار ہیں۔ وہ تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھنے پر کبھی اکتفا نہیں کرتے۔ وہ بے باک اور بے خوف ہو کر دل کی بات کہتے ہیں۔ اگر ایک طرف وہ برطانویوں کی سامراجی ذہنیت کے خلاف نفرت اور برہمی کا اظہار کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ انگریزی زبان کی رعنائیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اکثر اوقات وہ بے رحمی کی حد تک صاف گوئی پر اُتر آتے ہیں۔ مذمت یا مخالفت کے وقت وہ کبھی نرمی سے کام نہیں لیتے۔ چبا چبا کر بات کرنا ان کا وطیرہ نہیں۔ اس ضمن میں وہ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے۔ جس حوصلے اور بے لاگ انداز سے وہ خود اپنی گوشمالی کرتے ہیں وہ ان کی تحریروں کو اور بھی مسحور کن بنا دیتا ہے۔ اور سب سے

بڑھ کر ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک سچے فن کار اور کھرے ادیب کی غیرت ہے، خودداری ہے، عزتِ نفس کا پاس ہے .....

دوسری تحریروں کے علاوہ وہ اپنی ضخیم ڈائریاں بھی لکھتے رہتے تھے، خطوط کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ ان کے خطوط بے حد جان دار اور ولولہ خیز ہوتے تھے۔ ان خطوں کا اپنا ایک خاص لطف، ایک الگ چٹخارا تھا۔

تحریری کاوشوں اور ڈرامائی سرگرمیوں کے علاوہ بلراج عوامی زندگی میں بھی سرگرم عمل رہتے تھے۔ کوئی بھی ترقی پسند اقدام ہو — جلسہ، جلوس، مظاہرہ، چندہ جمع کرنے کی مہم، انتخابی مہم، کچھ بھی ہو، بلراج اس میں شرکت کرنے والوں کی صفوں میں سب سے آگے نظر آتے۔ جولائی 1955 میں انھوں نے وارسا (پولینڈ) میں منعقد ہونے والے نوجوانوں کے عالمی میلے میں ہندستانی نوجوانوں کے وفد کی سربراہی کی۔ واپس آتے ہی اکتوبر 1955 میں وہ چین روانہ ہوگئے۔ وہاں وہ ایک فلم ڈیلی گیشن کے ممبر کی حیثیت سے گئے تھے جس کی قیادت پرتھوی راج کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ خواجہ احمد عباس، چیتن آنند اور کئی دوسرے نام ور لوگ بھی گئے تھے۔ انھوں نے مختلف مواقع پر کرشنا مینن (جو لندن میں قیام کے زمانے سے بلراج کے دیرینہ دوست تھے)، شریمتی سبھدرا جوشی، شری امرناتھ ودّیا النکار اور دوسرے لوگوں کی انتخابی مہموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ عوامی زندگی سے ان کی وابستگی زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہی۔ اس میدان میں ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ انھیں اپنی بیٹی کی وفات کی المناک خبر بھی اندور میں ملی تھی، جہاں وہ انتخابی پروپیگنڈا کرتے پھر رہے تھے۔ کسی بھی جگہ جھگڑا ہو گیا ہو، فساد پھوٹ پڑا ہو، یا کوئی آسمانی مصیبت نازل ہوگئی ہو، بلراج کا دل فوراً تڑپ اُٹھتا اور وہ سب کچھ بھول کر بساط بھر ستم رسیدہ لوگوں کی مدد کرنے کو پہنچ جاتے۔ مرنے سے چند دن پہلے بھی وہ مہاراشٹر کے خشک سالی کی لپیٹ میں آئے ہوئے علاقوں کا دورہ کرنے کو نکل کھڑے ہوئے تھے۔ سماج کے تئیں ان کا احساسِ ذمہ داری نہایت شدید تھا۔ ملک کے کسی بھی حصے میں کوئی بڑا المیہ رونما ہوتا تو وہ الگ تھلگ اور بے تعلق رہ نہیں سکتے تھے۔ ایک بار مجھے بھی ایسی ہی مہم پر ان کے ساتھ جانے کا موقع ملا۔ ہولناک فساد نے بھیونڈی کے شہر کو تاراج کر دیا تھا۔ خواجہ احمد عباس، آئی۔ ایس۔ جوہر اور کچھ دوسرے فلمی لوگوں کے ساتھ ہم وہاں پہنچے۔ صبح کو ہم لوگ کار کے ذریعہ بمبئی سے روانہ ہوئے تھے، شام کو واپس بمبئی آگئے۔ مگر بلراج دو روز بعد پھر بھیونڈی پہنچ گئے۔ اس مرتبہ وہ اکیلے گئے اور وہاں ان کا قیام دو ہفتے تک طول کھینچ

گیا۔ اس عرصے میں جو کچھ ان سے بن پڑا، انھوں نے مصیبت کے ماروں کی امداد اور راحت کے لیے کیا۔ بعد میں انھوں نے بتایا: "اگر ایسی جگہ کوئی شخص ایک دن کے لیے جاتا ہے تو آفت رسیدہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے دکھوں کا تماشا دیکھنے کے لیے آیا ہے۔" بھیونڈی میں بلراج نے جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا اس کی روداد سے ان کی ڈائری کے بہت سے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ تشویش اور تعلق خاطر کا یہی احساس انھیں بنگلہ دیش بھی لے گیا۔ بنگلہ دیش کی جنگ کے دوران انھوں نے مغربی بنگال کے بہت سے علاقوں کا بھی دورہ کیا۔ ان کی ساری عوامی سرگرمیاں، ان کے سفر، ان کے امدادی کام دراصل ان کی شخصیت کا لازمی حصہ تھے۔ بھرپور سماجی شعور رکھنے والے فن کار اور شہری کی حیثیت سے یہ رنگ ان کے وجود کے تانے بانے میں رچا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے سماجی مسئلوں سے لے کر وقت کے عظیم ترین مسائل کے باب میں فکر اور تعلق کا احساس ظاہر کیے بغیر وہ رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ مرنے سے چند روز پہلے ہی انھوں نے ٹائمز آف انڈیا، کو ایک خط بھیجا تھا، جس میں انھوں نے جوہو کے ساحل کے جوار میں ناریل کے درختوں کو کاٹنے، گرانے کے خلاف دل سوزی کے ساتھ فریاد کی تھی۔

لکھنا لکھانا، فلموں میں کام کرنا، ڈراموں میں حصہ لینا، گھریلو ذمہ داریاں نبھانا — ان تمام مصروفیتوں کے ساتھ بلراج سماجی سرگرمیوں کو کس طرح یک جا کر لیتے تھے؟ ظاہر ہے یہ مرحلہ سہل نہ تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بلراج ڈسپلن کی پابندی اور گرم جوش وابستگی کی کیسی روشن مثال تھے۔ وہ مراسلت کا کام بھی خود ہی سنبھالتے تھے۔ ڈھیر ساری ڈاک ہوتی تھی اور پھر بھی خطوں کے جواب دینے میں وہ بہت مستعدی دکھاتے تھے۔ سفر بھی بہت کرتے تھے۔ سفر کے دوران میں مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ زیادہ تر سنجیدہ قسم کی کتابیں زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ وہ بمبئی کی ایک مضافاتی ٹرین میں سفر کرتے ہوئے اینجلز کی تصنیف "اینٹی ڈیہرنگ" جو کافی ضخیم اور موضوع کے اعتبار سے نہایت سنجیدہ علمی کتاب ہے۔ پڑھنے میں ایسے گم تھے کہ ماسوا کا ہوش ہی نہ تھا۔

بلراج کی عوامی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک بار انھیں راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کرنے کی پیش کش بھی کی گئی تھی۔ مگر بلراج نے اس بنا پر یہ پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ سیاسی کام کے لیے موزوں آدمی نہ تھے۔ تاہم ایک آدھ مہینے کے بعد انھیں اس پیش کش کا ایک روشن پہلو بھی نظر آنے لگا تھا۔ ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ راجیہ سبھا کی رکنیت قبول نہ کر کے انھوں نے غلطی کی ہے، کیوں کہ راجیہ سبھا کا ممبر بن کر انھیں ہندوستان کے سارے طول و عرض میں سفر کرنے کا موقع مل سکتا تھا اور اس طرح وہ پورے ملک کے حالات کا قریبی جائزہ لے سکتے تھے۔

8

گھر میں

یہ سوچنا درست نہ ہوگا کہ جب اتنی قدر شناسی اور کامیابی بلراج کے حصے میں آگئی تھی اور ان کو اپنے مرغوب مشغلوں میں منہمک رہنے کی پوری آزادی حاصل ہوگئی تھی، تو ان کی زندگی ہر اعتبار سے پُرسکون اور خوش گوار بن گئی ہوگی۔ حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ فن کار کی کشتی کو پرسکون موجیں کبھی میسر نہیں آتیں۔ وہ پتوار پر ہاتھ دھرے آرام سے کبھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ہر نیا رول اس کے لیے ایک نیا چیلنج لے کر آتا ہے۔ اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسے فن کارانہ سطح پر اتنی ہی جدوجہد کرنا پڑتی ہے جتنی وہ پہلے کیے ہوئے ہر رول کو نبھانے کے لیے کرتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ دل کا چین اور سکون، جمی جمائی زندگی شاید بلراج کی تقدیر میں تھی ہی نہیں کیونکہ جب سے انھوں نے گھر چھوڑا تھا، ان کی زندگی اضطراب اور جدوجہد سے عبارت رہی تھی۔ ان کے مزاج کی تیزی اور طوفانی کیفیت کو وقت اور حوادث نے دھیما ضرور کر دیا تھا، مگر فنا نہیں کر سکے تھے۔ یہ تیزیٔ طبع پُرسکون زندگی کی طرف انھیں لے جا ہی نہیں سکتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تقدیر پر آدمی کا بس کب چلا ہے؟ وہ کیسے جان سکتا ہے کہ کس سمت سے وہ وار ہونے والا ہے جو اس کے سارے سکون و قرار کو درہم برہم کر دے گا؟ وہ کس طرح زندگی کی الجھنوں اور تند و تیز جھٹکوں سے بچ سکتا ہے؟

بلراج میں پہل کی اہمیت تھی، آگے بڑھنے کی دھن تھی، نظر کی کشادگی تھی، لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود ان میں عملی جوڑ توڑ کا شعور بہت کم ہی تھا۔ دراصل وہ دنیادار آدمی تھے ہی نہیں۔ برس پر برس گزرتے گئے اور وہ زندگی کے روزمرّہ کے عملی مسئلوں کو حل کرنے کی ضرورت سے نظریں چُراتے رہے۔ انسانی رشتوں کے معاملے میں بھی، زندگی کے سارے رنگا رنگ تجربات کے باوصف، وہ کسی قدر آدرش وادی ہی بنے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مواقع پر وہ الجھے ہوئے، نازک حالات کا خاطر خواہ مقابلہ نہ کر سکے۔ بار بار انھیں سنگین دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے لمحوں میں اگر وہ زیادہ پریشان نہیں ہوئے تو اس کا سبب ان کی اندرونی طاقت تھی۔ اس طاقت کا سرچشمہ ان کی اپنی شخصی سالمیت

اور دیانت داری اور چند بنیادی اصولوں اور عقیدوں سے ان کی گہری وابستگی میں تھا۔ یہی قوت مشکلات کی گھڑیوں میں ان کے سر کو بلند رکھتی تھی اور وہ اطمینان کے ساتھ جس حد تک ممکن تھا بھرپور اور تخلیقی زندگی گزارنے کے اہل رہتے تھے۔

ان کی گھریلوں زندگی کچھ توجہّ کی طلب گار ہے۔

کافی برس تک بلراج ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے رہے تھے۔ یہ گھر جوہو چرچ روڈ پر تھیوسوفیکل کالونی میں تھا۔ دمینتی کی زندگی میں، اور اس کے بعد بھی جب بلراج اِپٹا کے ایک سرگرم کارکن تھے، یہ گھر چھوٹا ہونے کے باوجود عمل اور مصروفیت کا مرکز بنا رہتا تھا۔ نجی زندگی اپنے طور پر گزارنے کی یہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔ ایسا کوئی بھی گوشہ نہ تھا جہاں تھوڑی سی بھی خلوت حاصل ہو سکے۔ اس کی کھپریل کی چھتیں ہر برسات میں ٹپکتی تھیں۔ کسی بھی طرح کا آرام و آسائش یہ گھر کم ہی فراہم کرسکتا تھا۔ فلموں اور اِپٹا سے متعلق جوشیلے سرپھرے اسے ایک عوامی جگہ کے طور پر بے جھجک استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ بے دھڑک یہاں آتے جاتے تھے، چاہے دن یا رات کی کوئی بھی گھڑی کیوں نہ ہو۔ لیکن انسانی ہمدردی، خلوص اور محبت کی گرمی اس گھر میں ضرور رچی رہتی تھی۔ چونکہ یہ جوہو کے ساحل سے قریب تھا، اس لیے سنیچر اور اتوار کو چائے کی کیتلی ہر وقت اور ہر آنے جانے والے کی تواضع کے لیے ابلتی رہتی تھی۔ بہت سے لوگ بلراج کے اس گھر کو ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ سمندر میں نہانے کے لیے آتے اور کپڑے اس گھر میں بدلتے۔ اچھی طرح تیراکی سے لطف اندوز ہو کر وہ واپس آتے تو نہایت بے تکلفی کے ساتھ اپنے کیچڑ بھرے پیروں کے ساتھ کمروں میں داخل ہو جاتے، بلراج کے باتھ روم میں تازہ پانی سے دوبارہ غسل کرتے، اور اس کے بعد چائے کی ان گنت پیالیوں کے ساتھ سیاست پر بحث کرنے کے لیے ڈٹ جاتے۔ اس طرح بلراج کے لیے گھریلو زندگی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی اور ان کے بچے اکثر باپ کے تغافل کے شکار رہتے تھے۔

جب اِپٹا کی سرگرمیاں ماند پڑیں اور فلموں میں بلراج کی مصروفیت بڑھی تو یہ جگہ کچھ پُرسکون رہنے لگی۔ اس سکون کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بلراج نے اپنے بچوّں کو پبلک اسکولوں میں بھیج دیا تھا، تاکہ وہاں وہ باقاعدہ ضبط و نظم کی پابند زندگی گزار سکیں۔ خود بلراج اور سنتوش اس کے بعد بھی کئی برس تک اسی گھر میں رہتے رہے۔ ان کی چھوٹی بیٹی صنوبر بھی وہیں پل بڑھی۔

1961 میں بلراج نے اپنے الگ مکان کی تعمیر شروع کرادی۔ اس کے لیے انھوں نے ٹرنر رائل لین پر (اب اسے بلراج ساہنی مارگ کہا جاتا ہے) سن اینڈ سینڈ ہوٹل کے قریب زمین کا ایک بڑا سا

قطعہ خرید لیا تھا۔ جب یہ مکان بن کر مکمل ہو گیا تو آرکیٹیکٹ کے نام پر اس کا نام 'اکرام' رکھا گیا۔ یہ ماجرا شاید ہی کبھی ہوتا ہو کہ کسی مکان کا نام اس کا نقشہ تیار کرنے والے کے نام پر رکھا جائے۔ مگر یہاں معاملہ ذرا مختلف تھا۔ اس آرکیٹیکٹ کے اور بلراج کے درمیان اعتماد اور دوستی کا ایسا رشتہ استوار ہو چکا تھا کہ بلراج اپنی ممنونیت کا اظہار کرنے کے لیے مکان کا نام آرکیٹیکٹ کے نام پر رکھنے پر مجبور سے ہو گئے تھے۔

یہ مکان خوب لمبا چوڑا تھا۔ گنجائش بھی اس میں بہت تھی۔ مگر اس کا منصوبہ شاید اچھی طرح سوچ سمجھ کر نہیں بنایا گیا تھا۔ اس سے زیادہ چھوٹا، مگر زیادہ مربوط مکان بلراج کی ضرورت بہتر طور پر پوری کر سکتا تھا۔ یہ دور تک پھیلا ہوا مکان شخصی خلوت کے اصول کے پیشِ نظر تعمیر کیا گیا تھا — غالباً اس لیے کہ بلراج کے خاندان کے افراد پرانے مکان میں اس نعمت سے محروم رہے تھے۔ لیکن مکان کی تعمیر میں خلوت کے اصول پر مبالغہ کی حد تک زور دیا گیا تھا۔ یہاں خاندان کے ہر فرد کے لیے بہت بڑا بیڈ روم (باتھ روم کے ساتھ) مخصوص کیا گیا تھا۔ انداز کچھ ایسا تھا کہ ایک بار کوئی فرد اپنے کمرے میں پہنچ جائے تو باقی سارے خاندان سے اس کا رابطہ منقطع ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ دوپہر کے قیلولے کے وقت ایک پُراسرار سناٹا سارے گھر پر چھا جاتا۔ دونوں بڑے بچے پہلے ہی رہائشی پبلک اسکولوں میں بھیجے جا چکے تھے۔ صرف بلراج، سنتوش اور ان کی ننھی سی بچی صنوبر رہ گئے تھے۔ (بعد میں صنوبر کو بھی پرکیشت اور شبنم کے پاس، سناور کے لارنس اسکول میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا۔) انھیں رہنے کے لیے دراصل اس سے بہت چھوٹے مکان کی ضرورت تھی۔ یوں بھی مکان کی فضا یگانگت بھری اور خوش گوار اسی صورت میں بنتی ہے جب اس کے مکینوں کو مناسب خلوت تو حاصل ہو، لیکن دن میں بار بار ان کی آپس میں مڈبھیڑ بھی ہوتی رہے۔ اور یہاں ہر کمرہ گویا ایک بہت بڑا صندوق تھا، جس کا دوسرے کمروں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس قبیل کی عمارت آدمی کی تنہائی میں روز بروز اضافہ ہی کرتی چلی جاتی ہے اور وہ دوسروں سے بالکل الگ تھلگ، بس اپنے آپ میں گم رہنے لگتا ہے۔ بلراج کا کمرہ دوسری منزل پر ایک گوشے میں واقع تھا، جب کہ توش (سنتوش) کا نجی کمرہ سب سے اوپر کی منزل پر بنا ہوا تھا۔ توش یوں بھی مزاج، طبیعت اور عادت کے اعتبار سے کم آمیز تھیں اور اپنی ہی ذات کے خول میں سمٹی رہتی تھیں۔ جو رہی سہی کسر تھی، وہ اس مکان کی وضعِ تعمیر نے پوری کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس مکان میں کوئی ملاقاتی داخل ہوتا تو یہ احساس اسے پل بھر میں جکڑ لیتا کہ وہ کسی مقبرے میں گھس آیا ہے۔ کام یابی اور خوش حالی اب بلراج کے قدم چوم رہی تھی، مگر اس مادّی آسودگی کے باوجود ماحول کی یہ انقلابی نوعیت کی تبدیلی ان کے لیے خالص اور

بے میں نعمت ثابت نہیں ہوئی۔ یہاں سکون ضرور تھا، مگر قبرستان جیسا سکون۔

بلراج کی سماجی زندگی بھی رفتہ رفتہ محدود ہوتی چلی گئی۔ وہ اب مضافاتی ٹرینوں میں گیت نہیں گاتے تھے، جس طرح ایک زمانے میں اپٹاکے دوستوں کے ساتھ گایا کرتے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں اب بہت کم لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے تھے، اور جو آتے بھی تھے وہ اتنے مصروف لوگ ہوتے تھے کہ چائے کی پیالیوں پر گھنٹوں بیٹھے باتیں کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہ تھا۔ اسی لیے بلراج کی زندگی میں اب لاابالی پن اور یار باشی کا وہ رنگ باقی نہ رہا تھا جو ایک دور میں ان کی وضع زندگی کی لازمی خصوصیت تھا۔ اب ان کی زندگی میں متانت اور سلامت روی زیادہ، کھلنڈراپن اور شوخ طبعی کم رہی ہوئی تھی۔ قاعدہ قرینہ اور ضبط و نظم بھی بڑھ گیا تھا۔ ہر مشغولیت، ہر ملاقات میں وقت کی پابندی وہ شدت کے ساتھ کرتے تھے۔ اسٹوڈیو وغیرہ بھی وقت پر پہنچتے تھے۔ لیکن وہ خوش اور مست مولاپن اب ہوا ہو چکا تھا، جو کسی زمانے میں ان کے مزاج کا حصہ بنا ہوا تھا۔

پنجاب میں جا کر بس جانے کی خواہش ابھی تک ان کے دل میں زندہ تھی، لیکن اس کی جزوی تکمیل لکھنے لکھانے پر پابندی سے دھیان دینے سے اور 'مضامینِ نو کے انبار' لگانے سے ہو جاتی تھی۔ ان کے بچے بڑے ہو گئے تھے اور ان کی ضرورتوں کو بلراج کی نظر میں خود اپنی ضرورتوں پر ترجیح حاصل تھی۔ پریکشت نے تو خیر اپنے بچپن کا ابتدائی دور پنجاب میں ہی گزارا تھا اور اس کے بعد بھی وہ پہلے سناور میں اور پھر دہلی کے سینٹ اسٹیفنز کالج میں تعلیم حاصل کرتا رہا تھا، لیکن بلراج کے باقی دونوں بچے، شبنم اور صنوبر، پنجاب سے بالکل بیگانہ رہے تھے۔ پنجاب سے زیادہ وہ بمبئی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ بلراج کے بمبئی چھوڑنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ وہ لمبا چوڑا مکان بھی ثابت ہوا جو انھوں نے بمبئی میں بنوالیا تھا۔ وطن کی ہڑک اور پردیس سے دیس کو لوٹ جانے کی تڑپ اپنی جگہ، لیکن سارے فیصلے محض آرزو کی بنیاد پر نہیں کیے جا سکتے۔ فیصلے کرتے وقت حالات کے تقاضوں کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ حالات بلراج کے لیے سلجھنے کی جگہ روز بروز مزید الجھتے ہی چلے گئے۔ چنانچہ بلراج بمبئی میں ہی چار و نا چار رہتے رہے، ہاں پنجاب میں ان کے دورے ضرور کثرت سے ہونے لگے۔ وہاں کبھی وہ دیہات کے چکر لگا آتے، کبھی قصبوں اور چھوٹے شہروں میں ڈرامے اسٹیج کرتے پھرتے۔ اس کے علاوہ پنجاب کے ادیبوں، فن کاروں اور عوامی شخصیتوں کے ساتھ ان کی خط و کتابت بھی بڑے پیمانے پر چلتی رہتی تھی۔ اس سے بھی انھیں پنجاب کی زندگی سے قریبی رابطہ قائم رکھنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔

اس درمیان کچھ اور واقعات رونما ہوئے۔ پتاجی اور ماتاجی، دونوں بمبئی آکر بلراج کے ساتھ

رہنے لگے۔ 1957 میں پتاجی کی صحت بہت خراب ہوئی تھی۔ میں کام کرنے کے لیے ماسکو گیا ہوا تھا۔ بلراج ماں باپ کو دہلی میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے، اس لیے انھیں بمبئی ہی بلا لیا اور بساط بھر ان کی خدمت کی۔ لیکن زندگی بھر کے بندھن جلد ہی ٹوٹ گئے۔ 1961 میں پتاجی چل بسے اور پھر چھ برس بعد ماتاجی بھی گزر گئیں۔ چار پانچ سال کے اس عرصے میں کبھی کبھی پتاجی اور ماتاجی دہلی میں آکر بھی رہ جاتے تھے۔ دہلی میں ان کے قیام کے دوران بلراج بار بار دہلی کے پھیرے کرتے، تاکہ ان کی ضرورتوں پر پورا دھیان دے سکیں۔ اس طرح بھی بلراج پر ذمہ داریوں کا بوجھ کافی بڑھ گیا تھا۔

1965 میں پریکشت ماسکو سے واپس آگیا۔ وہاں وہ گورکی انسٹی ٹیوٹ آف سینما ٹوگرافی میں فلم ڈائرکشن سیکھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ جس فلمی فضا میں وہ رہ کر آیا تھا وہ ہندوستان کی فلمی فضا سے یکسر مختلف تھی۔ پھر وہاں اسے سوویت فلم انڈسٹری کی بڑی بڑی، قدآور شخصیتوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا، جن میں بینڈرچک اور دوسرے اساتذۂ فن بھی شامل تھے۔ اس لیے بمبئی کی فلم انڈسٹری کا ماحول اور حالات اس کے لیے سراسر اجنبی تھے۔ ان نئے حالات کے سانچے میں خود کو ڈھالنا اسے بے حد دشوار مرحلہ معلوم ہوا۔ وہ اس معاملے میں بہت زود حس تھا کہ اسے بلراج ساہنی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے رول ملیں۔ وہ اپنے پیروں پر آزادانہ کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ لوگ اس کی جداگانہ ہستی کو تسلیم کریں اور اسے کسی کے سہارے کا محتاج نہ سمجھیں۔ اُدھر ہر باپ کی طرح بلراج بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا جدوجہد کی ان سختیوں کو جھیلنے سے بچ جائے جو خود ان کے حصے میں آئی تھیں۔ ان کی بھی تمنا تھی کہ بیٹا ان کے تجربات سے فائدہ اٹھائے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ پتاجی بھی بلراج کے لیے یہی کرنا چاہتے تھے، اور اب بلراج اپنے بیٹے کی اسی طرح مدد کرنے کے آرزومند تھے۔ کافی دن تک پریکشت نے خود کو بے انتہا بیگانہ اور اکھڑا اکھڑا محسوس کیا، کیوں کہ وہ نہ فلم انڈسٹری کے ساتھ تال میل قائم کرنے میں کامیاب رہا، نہ اپنے باپ کے ساتھ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریق کھنچے کھنچے سے رہنے لگے۔ اس کے علاوہ توش کے اور جوان ہوتے بچوں کے درمیان بھی خلیج نمودار ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی تو ایک دوسرے کو سمجھنا اور نباہ کی راہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ کم سنی کے دنوں میں ان بچوں کو بھرپور گھریلو زندگی کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس دکھ بھرے احساس نے بلراج کو اکثر ملول کیا تھا کہ ان کا پُرانا گھر ایک پُرشور عوامی جگہ بن کر رہ گیا تھا اور ان کے بچے تغافل کی بھینٹ چڑھ رہے تھے۔ انھیں ماں باپ کی طرف سے اتنی توجہ نہیں مل رہی تھی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ پھر بعد میں انھیں پڑھائی کے لیے پبلک اسکولوں

میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس طرح وہ ماں باپ سے ذہنی طور پر اور بھی دور ہو گئے تھے۔ بچّوں کی شخصیت اور مزاج کی تشکیل میں خاندانی زندگی کا یہ پہلو بھی بڑی حد تک کارفرما رہا، اور نتیجے میں ایک دوسرے سے نباہ کرنے اور مطابقت پیدا کرنے کی راہ میں دشواریاں اور بھی بڑھ گئیں۔

شاید اس سلسلے میں سب سے زیادہ ستم رسیدہ شبنم رہی، جو دمینتی سے بلراج کی دوسری اولاد تھی۔ شبنم 1943 میں انگلستان میں پیدا ہوئی تھی۔ ابھی وہ ساڑھے تین برس کی ہی تھی کہ ماں کے سائے سے محروم ہو گئی۔ اس کے بچپن کے دنوں میں بلراج اِپٹا کی سرگرمیوں میں اور فلموں میں قدم جمانے کی جدوجہد میں گھرے رہے۔ بعد میں شبنم کو پڑھائی کے لیے سناور کے لارنس اسکول میں بھیج دیا گیا۔ مگر یہ سب ایک اعتبار سے حالات کا جبر تھا۔ بلراج کو اپنے بچّوں سے گہرا لگاؤ تھا —— خاص طور سے شبنم سے، جس کے معاملے میں ایک شدید احساسِ جرم ان کے دل کو کچوکے لگاتا رہتا تھا، رہ رہ کر ان کے دل میں یہ ٹیس اُٹھتی تھی کہ اپنی اس اولاد کا انھوں نے خاطر خواہ خیال نہیں رکھا جس کی ماں مرتے دم اسے ان کو سونپ گئی تھی کہ اچھی طرح اس کی دیکھ بھال کریں۔

وقت گزرتا گیا۔ شبنم بڑی ہو گئی —— جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہوئی ایک خوب صورت لڑکی! اس نے بالکل اپنی ماں جیسا بشاش، کھلکھلاتا، چہچہاتا مزاج پایا تھا۔ ٹینس کی وہ ماہر کھلاڑی تھی۔ وہ ہو بہو اپنی ماں پر گئی تھی، اس لیے بلراج اور گھر کے دوسرے لوگوں کی اور بھی زیادہ چہیتی ہو گئی تھی۔ مگر زندگی اس کے لیے (اور نتیجے کے طور پر بلراج کے لیے بھی) بہت بے رحم اور سفاک ثابت ہوئی۔ بمبئی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد اس کی شادی ہو گئی، لیکن جلد ہی اس کی شادی شدہ زندگی میں طوفان آ گیا۔ اس بے آہنگی اور عدمِ مطابقت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ شبنم شادی کے بعد جس ماحول میں پہنچی تھی وہ اس ماحول سے قطعی مختلف تھا جس میں اس نے پرورش پائی تھی۔ اس کی شادی ملازمت پیشہ لوگوں کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ ایسے لوگوں میں رہن سہن کے انداز، کفایت شعاری، آمدنی اور اخراجات کے نپے تلے تخمینے، دکھاوے کے ٹھاٹ باٹ وغیرہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں شبنم کے لیے انتہائی اعصاب شکن اور صبر آزما تھیں۔ ان کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار بھی نہیں تھی کیونکہ اس سلسلے میں اسے تربیت ہی نہیں ملی تھی۔ سسرال کے مقابلے میں اس کی زندگی میکے میں کہیں زیادہ آزاد، سہل اور آسائش بخش رہی تھی۔ ایک بڑی کوتاہی اس میں یہ تھی کہ خانہ داری کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی، جب کہ ملازمت پیشہ لوگوں میں اسی وصف کو سب سے زیادہ اہم گردانا جاتا ہے۔ بلراج کی تنگ دستی کے دنوں کی پرچھائیں بھی اس کی یادوں میں محفوظ نہیں رہی تھی۔ اس

وقت وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ اس کے بعد اس کا لڑکپن خاصی خوش حالی اور عیش و آرام میں گزرا تھا، اس لیے حساب کتاب رکھنے اور اخراجات پر قابو پانے والا مزاج اس نے پایا ہی نہ تھا۔ ویسے وہ بہت محتاط طبیعت کی تھی، دوسروں کا خیال بھی بہت رکھتی تھی، مگر اب شادی کے بعد جن حالات کا اسے سامنا کرنا پڑا اس میں وہ چکرا کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ سگھڑ گرہستن کے طور پر اس سے جو اُمّیدیں باندھی گئی تھیں، جو مطالبے کیے گئے تھے، انھیں پورا کرنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں میں اس کی ساری ہمّت، ساری خود اعتمادی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

برِاج کے دل کا سکون ملیامیٹ ہو کر رہ گیا۔ شبنم کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے انھوں نے بہت دوڑ دھوپ کی۔ مگر وہ اندھی محبّت کرنے والے آدمی تھے۔ اولاد کے لیے ان کی بے پناہ چاہت میں عقل کو دخل نہ تھا۔ ان میں نہ جوڑ توڑ کی اہلیت تھی، نہ صبر کا مادہ۔ ان کی بیٹی دکھ جھیل رہی تھی ـــــ بس یہی آگاہی اُن کے ذہنی توازن کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی تھی۔ پھر اس وقت ان کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی جب انھیں پتہ چلا کہ شبنم اس لیے بہت سی باتیں چھپا جاتی ہے کہ کہیں وہ مزید مضطرب اور رنجیدہ نہ ہو جائیں۔ شبنم اپنی طرف سے اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں انھیں کچھ بھی نہیں بتاتی تھی۔ جو کچھ حالات معلوم ہوتے تھے، دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتے تھے۔ یہ تلاطم اسی طرح جاری رہا، یہاں تک کہ ایک روز شبنم خودکشی کی کوشش کر بیٹھی۔

ہمارے ملک میں جب شادی اس طرح کا بھنور بن جاتی ہے تو بے چارے لڑکی کے باپ کے لیے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ وہ لڑکی کو اپنے گھر واپس بلا لیتا ہے۔ ایسی صورت میں لڑکی کے حالات سدھرنے کی سبیل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور کسی روزگار سے لگ جانے کی اہل ہو جائے۔

بے چاری شبنم حالات کے بگولوں سے ایسی حواس باختہ ہوئی کہ اپنا خاتمہ کرنے پر تُل گئی۔ مگر اس کی تقدیر میں تھوڑی سی عمر اور لکھی تھی، اس لیے بچ گئی۔ اس معاملے کا ایک الم ناک پہلو یہ بھی تھا کہ شبنم ہمیشہ خود کو ہی قصور وار ٹھیراتی تھی۔ اسے اپنے اوپر ہی غصّہ آتا تھا کہ ایک گرہستن کی ذمہ داریاں پوری کرنے سے وہ قاصر کیوں ہے؟

کچھ ہی دن میں شبنم اعصابی انتشار میں مبتلا ہو گئی اور ایک نفسیاتی معالج کے زیرِ علاج رہنے لگی۔ کبھی اس کی حالت سنبھل جاتی اور وہ ہنستی، چہچہاتی پھرتی، اعتماد کا پیکر نظر آتی، اس کے بعد پھر اضمحلال کا دورہ پڑتا۔ اس کا ذہن لڑکھڑانے لگتا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اسے کیا کرنا ہے، کس

طرف جانا ہے۔

ایک بڑی آفت یہ تھی کہ بلراج کو اس قیامت کا سامنا اکیلے ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ پریکشت خود اپنے مسائل میں بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ پھر ابھی اس کی عمر بھی زیادہ نہ تھی کہ معاملے کی روزافزوں سنگینی کو سمجھ لیتا۔ توش کو بھی تشویش تو بہت تھی، شبنم کی حالت پر ان کا دل بھی بہت کُڑھتا تھا، مگر وہ بس اپنی رائے، اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے پر اکتفا کرتی تھیں، اس سے آگے کچھ نہیں۔ آخری فیصلہ کرنے کا مرحلہ وہ بلراج پر ہی چھوڑ دیتی تھیں۔ ان کی اس وضعِ احتیاط نے انھیں کچھ الگ تھلگ سا کر دیا تھا اور بلراج کو اپنی بساط کے مطابق تنِ تنہا ہی اس مسئلے سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ اور بلراج اتنے سراسیمہ اور پریشان ہو رہے تھے کہ جذبات سے الگ ہٹ کر اور بےلاگ ہو کر صورتِ حال کا جائزہ لے ہی نہیں سکتے تھے۔ ایسے عالم میں شاید کوئی بھی باپ معاملے کو اکیلا نہیں نمٹا سکتا۔

ان ہی دنوں بلراج نے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا تھا:

مجھ میں دنیاداری کی سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ مجھے اپنے فیصلوں پر بھی بھروسا نہیں ہے۔ لیکن اس وقت میرے سامنے اپنی بیٹی کی زندگی کا سوال ہے، اور میں اس معاملے میں اپنی ناکارہ عقل ہی کا سہارا لینے پر مجبور ہوں۔ اگر میری نیت نیک ہے تو خدا ضرور میری سنے گا اور میری دعا قبول کرے گا .... آج صرف میری محبت مجھے راستہ دکھا رہی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ میں اس آزمائش پر کھرا اُتروں گا.... آج کل میرا واحد سہارا میری بیٹی صنوبر ہے۔ اس کی تعریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے .... شبنم اسکول میں پڑھانے کے لیے پابندی سے جاتی ہے۔ وہ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں ہے۔ لیکن اپنی وہ ذرا بھی پروا نہیں کرتی۔ کبھی بہت بولنے لگتی ہے، کبھی بالکل گُم صُم رہتی ہے۔ اس حالت کو ٹھیک ہونے میں ابھی وقت لگے گا....

بلراج اپنے خطوں میں بار بار صورتِ حال کی سنگینی کو چھپانے اور اسے کم سے کم تر باور کرنے کی کوشش کرتے رہے، تاکہ ہم لوگ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ ویسے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ معاملات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے لکھا:

تمھارا کہنا ٹھیک ہے۔ اگر آدمی کچھ وقت کے لیے عمل کے میدان سے ہٹ جائے تو وہ حالات کا جائزہ الگ تھلگ اور بےلاگ ہو کر لے سکتا ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب طرح طرح کے بکھیڑے اسے عمل کے میدان سے دور ہونے کی

اجازت اور مہلت دے دیں ۔۔۔۔ تاہم تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔
یہ تقدیر کا حکم ہے کہ میری زندگی ایک مسلسل ڈراما بنی رہے ۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

لیکن ان کی سراسیمگی اور فکریں بڑھتی ہی گئیں۔ ان کا اضمحلال ان کے خطوں سے روز بروز زیادہ جھلکنے لگا۔ اگست 1968 میں انھوں نے مدراس سے جو خط مجھے بھیجا، اس میں انھوں نے پھر لکھا :

یہاں آئے ہوئے مجھے دو دن ہو چکے ہیں۔ آج تیسرا دن ہے ۔۔۔۔ پہلے روز میرا ذہن بہت پریشان اور بے قرار تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اگر آدمی گڑبڑ کی جگہ سے کہیں دور نکل جائے تو ناقابلِ برداشت فکریں بھی کم ناقابلِ برداشت بن جاتی ہیں ۔۔۔۔

اس سے اگلے مہینے انھوں نے مجھے منالی سے ایک خط میں لکھا (وہاں وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں گئے تھے) : "موسم یہاں ان دنوں بے حد خوش گوار ہے، مگر میرا ذہن فکروں اور پریشانیوں میں ایسا گھرا رہتا ہے کہ موسم کی رعنائیوں پر دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملتا۔" (خط مورخہ 8 ستمبر 1968)۔
اپریل 1970 میں پریکشت کی شادی جیتن آنند کی بھانجی ارونا سے ہو گئی۔ شبنم کا معاملہ ویسا ہی رہا۔ اس میں سُدھار کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ بلراج کی ذہنی اذیت کا دور بھی اسی شدت کے ساتھ جاری رہا۔ اگست 1970 میں انھوں نے لکھا :

شاید میرے پچھلے خط نے تمھیں فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔ معاف کرنا۔ میں جانتا ہوں کہ ایسی باتوں پر کڑھنا اور جی جلانا حماقت کی انتہا ہے۔ زندگی بجائے خود بے حد حسین ہے۔ عمرِ رواں کا ہر دن ایک نعمت، ایک برکت ہے۔ کتنے جاں فزا تھے وہ لمحے جب میں ناگن جھیل میں تیر رہا تھا۔ سچ ہے، پریشانیاں آدمی کو بہت حقیر بنا دیتی ہیں۔ آئندہ میں پوری کوشش کروں گا کہ فکروں کے ہاتھوں ہراساں نہ ہوں۔ فکریں دل کو لگانے سے آدمی کو خواہ مخواہ ضرر پہنچتا ہے اور حاصل کچھ ہوتا نہیں۔
یہ جان کر تمھیں خوشی ہوگی کہ اس کم بخت ڈرامے پر میں نے پھر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ خوب انہماک رہتا ہے۔ اس بار ٹھان لی ہے کہ اسے مکمل کر کے ہی دم لوں گا ۔۔۔۔

بلراج مقدور بھر جی داری کے ساتھ ان سنگین حالات کا سامنا کرتے رہے اور انھیں بدلنے کے

جتن بھی انھوں نے جاری رکھے، لیکن بگڑی ہوئی بات بن نہ سکی۔شبنم کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔

میری زندگی کا عالم پہلے جیسا ہی ہے۔ وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے؛ باپ اور شوہر، دونوں حیثیتوں میں ناکامی میرے نصیب میں آئی ہے۔ کبھی کبھی جب زندگی کچھ جینے کے قابل نظر آتی ہے تو ان لمحوں کو غنیمت سمجھ کر میں کچھ لکھنے لکھانے کی نذر کر دیتا ہوں۔ ایسے لمحوں میں زندگی کو میں اپنے آغوش میں سمیٹ لیتا ہوں۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ اب سورج کم ہی چمکتا ہے اور اکثر اوقات مطلع ابر آلود ہی رہتا ہے۔ (خط مورخہ 13 دسمبر 1971)۔

ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ان کا ایک اور خط آیا:

میں ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوں جہاں میں یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ کیا صحیح ہے، کیا غلط۔ جو کچھ خدا دکھائے سو نا چار دیکھنا۔ جو تقدیر میں ہے، بھگتنا ہی پڑے گا۔ (خط مورخہ 19 جنوری 1972)۔

اس درمیان شبنم کے سر میں ایک چکتا بن گیا تھا، جو بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اب تک اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ شبنم کبھی کبھی یہ شکایت کرتی بھی تھی کہ اسے ایک کی جگہ دو دو چیزیں نظر آتی ہیں، مگر نفسیاتی معالج اور فیملی ڈاکٹر دونوں اس شکایت کو یہ سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے کہ اس طرح شبنم دوسروں کی توجہ، ہمدردی اور محبت حاصل کرنے کی لاشعوری کوشش کرتی ہے۔

اور ان ہی اذیت ناک حالات میں، 5 مارچ 1972 کو بے چاری شبنم چل بسی۔ اس کی وفات کے وقت بلراج بمبئی میں نہ تھے۔ وہ الیکشن کی مہم پر مدھیہ پردیش گئے ہوئے تھے۔

شبنم کی موت سے بلراج اندر ہی ٹوٹ کر رہ گئے اور پھر مکمل طور پر کبھی بحال نہ ہو سکے۔ اس سانحہ کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کے انھوں نے بہت جتن کیے، مصروفیتوں میں گھر کر اس دکھ کو بھولنا چاہا، کام کے ریلے میں اس غم کو ڈبونے کی کوشش کی، مگر ساری تدبیریں بے اثر رہیں۔ وقت کے ساتھ اس صدمے کو سہنا ان کے لیے دشوار سے دشوار تر ہوتا گیا۔

"گرم ہوا" کے ایک سین میں ایک بیٹی خودکشی کر بیٹھتی ہے۔ اس کا باپ (یہ رول بلراج نے ادا کیا تھا) اس کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ کیا قیامت بپا ہو چکی ہے۔ یہ اس فلم کا سب سے تیکھا، چبھتا ہوا اور پُر اثر سین ہے۔ بلراج اس میں منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہتے اور پھر بھی ایک باپ کے دل کے لہولہو ہو جانے کی کیفیت کا اظہار بھرپور ڈھنگ سے کر جاتے ہیں۔ اس سین،

کو بلراج کی اداکارانہ صلاحیت کا نقطۂ عروج قرار دیا گیا اور ہر طرف اس کی تعریفیں ہوئیں لوگوں کو یہ راز معلوم نہیں تھا کہ بلراج نے تو یہ سین صرف دہرایا تھا۔ کیونکہ اس سین کو وہ اپنی اصلی زندگی میں پہلے ہی جی چکے تھے۔

آخری دَور

بلراج اندر ہی اندر جو اذیت جھیل رہے تھے، اس کا ذکر بھی وہ کم ہی کرتے تھے۔ ہونٹوں کو سئے رہنا انھوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ جس حد تک بھی ممکن تھا وہ معمول کے انداز میں کام میں منہمک رہتے تھے۔ فلمی کام انھوں نے کافی کم کر دیا تھا، تاکہ لکھنے لکھانے کے لیے انھیں مزید وقت مل سکے۔ لگ بھگ دو برس پہلے انھوں نے پریت نگر میں ایک چھوٹی سی کاٹیج خرید لی تھی۔ اس کی انھوں نے مرمت بھی کرا لی تھی، اسے آراستہ بھی کرا لیا تھا۔ مدعا یہ تھا کہ پنجاب میں زیادہ طویل عرصے کے لیے جایا کریں اور ٹھیرا کریں۔ انھوں نے اپنی پرانی کار بھی میرے پاس چھوڑ رکھی تھی، تاکہ پنجاب میں گھومنے پھرنے میں انھیں سہولت رہے۔

فلم "گرم ہوا" (جس کا موضوع یہ تھا کہ برِ صغیر کی تقسیم کے بعد مسلمانوں پر کیا گزری) بلراج کا آخری کارنامہ تھی۔ اسے راج ہنس کے آخری نغمے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بلراج نے اس فلم میں آگرہ کے ایک ایسے مسلمان تاجر کے رول میں غضب کی اداکاری کی تھی جو اپنے ہی وطن میں اجنبی بن جاتا ہے۔ اس رول کو جیتا جاگتا بنانے میں بلراج کو خود اپنے تجربات اور محسوسات سے بھی مدد ملی تھی۔ بٹوارے کی تباہ کاری انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی بھی تھی اور اپنے خاندان کی حد تک جھیلی بھی تھی، جو اپنی سرزمین سے اُجڑنے اور اس ہولناک دور سے گزرنے پر مجبور ہوا تھا۔ اس فلم میں مسلمان تاجر کی بیٹی کی موت ہو جاتی ہے۔ اس وقت باپ کی جو حالت ہوتی ہے، بیان سے باہر ہے۔ اگر اس سین میں بلراج کی اداکاری حقیقت سے بہت قریب اور دل پر دیرپا اثر چھوڑنے والی نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بلراج کے اپنے دل کے درد نے، ان کے اپنے سوزِ دروں نے اس رول سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ اس موقع پر فلم کے اس مسلمان کردار نے جس وقار، متانت اور ضبط کا مظاہرہ کیا ہے، وہ بھی بلراج کی اپنی شخصیت کا، ان کی اپنی وارداتِ دل کا پرتو تھا۔ کچھ پہلوؤں سے ان کی اداکاری کا یہ آخری معرکہ عظیم ترین فن کارانہ معرکہ تھا۔

اب اگر بلراج اپنی سکت اور اپنی بساط سے بڑھ کر اپنے آپ کو مصروفیتوں کے میدان میں

دوڑا رہے تھے۔ انھوں نے اپنا ڈراما " باپو کیا کہے گا ؟ " مکمل کرتے ہی ایک ناول پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ پنجاب میں جا بسنے اور اپنا سارا وقت ادبی مشاغل کی نذر کرنے کا پُرانا خواب پھر ان کے ذہن پر چھا گیا تھا۔ اُدھر حکومت اس تجویز پر غور کر رہی تھی کہ بلراج کو پونا کے فلم انسٹی ٹیوٹ کا پرنسپل بنا دیا جائے۔ (ہم لوگوں کو اس تجویز کا علم بلراج کی موت کے بعد اس وقت ہوا جب سٹری آئی۔ کے۔ گجرال نے، جو ان دنوں اطلاعات ونشریات کے مرکزی وزیر تھے، اپنی تقریر میں اس کا ذکر کیا)۔ 1972 میں بلراج کو پنجاب کی گورو نانک یونیورسٹی کی سینٹ کا ممبر نامزد کیا گیا۔ انھیں راجیہ سبھا کی رکنیت کی پیش کش بھی کی گئی، مگر یہ پیش کش انھوں نے قبول نہیں کی۔ فلمی کام تو انھوں نے کم کر ہی دیا تھا، مگر سماجی فلاح کے کام سے دامن بچانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ جہاں بھی انسان یا قدرت کی نازل کی ہوئی گڑبڑ مچتی، بلراج بے دھڑک اُدھر کا رُخ کر ڈالتے۔ ہوتے ہوتے وہ وقت آگیا جب ان کا سارا وقت سفر کرنے میں، ڈرامے اسٹیج کرنے میں اور بمبئی میں اپنا کام سمیٹنے میں گزرنے لگا۔

نومبر 1972 میں بلراج کو دہلی کی جواہر لال یونیورسٹی کے کنووکیشن میں خطبہ دینے کے لیے مدعو کیا گیا۔ ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی فلم آرٹسٹ کو جلسۂ تقسیمِ اسناد سے خطاب کرنے کا اعزاز بخشا گیا ہو۔ بہت سے ناک چڑھے، چیدہ پرست دانش وروں نے تو سرے سے اس تصور کا ہی خوب مذاق اُڑایا۔ خود یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا بھی اس شک میں مبتلا تھے کہ کہیں یہ انتخاب غلط تو نہیں ہوا ہے۔ کنووکیشن کی صبح کو دہلی کے اخبارات میں خطوط چھپے جن میں کنووکیشن سے ایک اداکار کے خطاب کرنے کی ہنسی اُڑائی گئی تھی۔ لیکن بلراج کا خطبہ اتنا معرکۃ الآرا اور ولولہ انگیز ثابت ہوا کہ تمام حاضرین مسحور ہو گئے۔ اور عش عش کرتے ہوئے اُٹھے۔

بلراج نے اس خطبے میں بڑی صاف صاف اور دو ٹوک باتیں کہی تھیں۔ اپنے بے مثال، سادہ، بے باک، سہل اور بے لاگ انداز میں وہ طلبا کو سنا کر کہنے اور گھما پھرا کر انھیں سمجھانے کی بجائے براہِ راست انھیں کھری کھری سنا رہے تھے۔ ان کی تقریر میں حکایتوں، ذاتی تجربوں اور یادوں وغیرہ کی گُل کاری جابجا شامل تھی۔ بیان کی تاثیر اور قوت کا یہ عالم تھا کہ سامنے کی کئی سچائیاں جن پر لوگوں کی نظر کم ہی جاتی ہے، سامعین کے دلوں پر نقش ہو گئیں اور طالبِ علم برادری کان کھڑے کرنے اور سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

اس تقریر میں آزادیٔ فکر کی پُرزور وکالت کی گئی تھی۔ شدید دکھ کے احساس کے ساتھ بلراج کہہ رہے تھے:

میں جس طرف بھی رُخ کرتا ہوں، یہی دیکھتا ہوں کہ آزادی کے 25 برس بعد بھی
ہماری حالت اس پرندے جیسی ہے جسے لمبی مدت کی قید کے بعد پنجرے سے رہائی ملی ہو۔
اسے خبر ہی نہیں ہوتی کہ اپنی آزادی کا وہ کیا کرے۔ اس کے پاس پر تو ہوتے ہیں، مگر
وہ کھُلی فضا میں اُڑتے ہوئے ڈرتا ہے۔ وہ طے شدہ حدوں کے اندر ہی رہنے کا آرزومند
ہوتا ہے ـــ جس طرح پنجرے میں رہتا تھا۔

بلراج کے تصور کے مطابق آزاد آدمی وہ ہے جو اپنے لیے اور اپنے طور پر خود سوچے، خود فیصلہ کرے، خود عمل کرے۔" لیکن غلام اس اہلیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے ذہن سے کام لیتا ہے، دوسروں سے افکار اُدھار مانگتا ہے، فیصلے کرتے وقت لڑکھڑاتا ہے، اور اکثر صورتوں میں پٹی پٹائی ڈگر پر چلنے کو ہی ترجیح دیتا ہے۔"

پھر بلراج مثالوں کے ذریعہ بتاتے ہیں کہ کس طرح عمل کے تقریباً ہر میدان میں ہم رہنمائی کے لیے مغرب کا منھ دیکھتے ہیں۔ دوسرے شعبوں کے مقابلے میں ثقافت کے میدان میں یہ میلان اور بھی زیادہ نمایاں ہے۔ ہماری فلمیں عموماً مغربی فلموں کی نقل اور چربہ ہوتی ہیں۔

ہمارے ناول نویس، افسانہ نگار اور شاعر بڑی آسانی سے مغرب میں رائج فیشن کے
دھارے میں بہہ جاتے ہیں۔ مانگے ہوئے، آدرش کے درجے کو پہنچائے ہوئے افکار کو
اپنانے کی عادت ہر جگہ اور ہر طرف کسی نہ کسی روپ میں جلوہ گر ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ
ہم خود اپنی چیزوں کو بھی اسی وقت سراہتے ہیں جب غیر ملکی انھیں سراہنے لگتے ہیں۔
ٹیگور سارے ہندوستان میں گرودیو اسی وقت کہلائے جب انھیں سویڈن سے نوبل
پرائز مل گیا۔ ہمارا ستار، شاہکار ساز اسی وقت بنا جب امریکیوں نے روی شنکر کو
ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یوگا بھی اپنی جنم بھومی میں اسی وقت
مقبول ہوگا جب یہ یورپ سے سند حاصل کرلے گا۔

یہ خالص عالمانہ، خشک منطقی خطبہ نہ تھا اور نہ اس میں ایک تقریباتی رسم کی خانہ پری کا انداز تھا۔ اس میں تو بلراج نے طالبِ علم برادری کو براہِ راست مخاطب کیا تھا۔ اسی لیے ان کا ایک ایک لفظ سننے والوں کے دلوں میں اُترتا چلا گیا۔ اس خطبے میں آزادیٔ فکر کی وکالت تو کی ہی گئی تھی، اس کے ساتھ یہ تلقین بھی کی گئی تھی کہ نئی نسل کو غلامانہ ذہنیت سے چھٹکارا پانے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا، ایسی قدروں کو پروان چڑھانا ہوگا جو ایک آزاد اور خود مختار ملک کے شہریوں کے شایانِ شان ہوں۔

عوامی زندگی میں بلراج کے انہماک میں آخر دم تک کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن اس زخم کی ٹیس پر قابو پانا ان کے لیے دشوار سے دشوار تر ہوتا گیا جو مسلسل ان کے دل کا خون کرتا رہا تھا۔

فلمی مصروفیات کو کم کر دینے کے بعد اب مجھے فرصت کا کافی وقت ملنے لگا ہے۔ لیکن میرا ذہن اکثر خالی خالی اور کورا ہی رہتا ہے اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اپنا کیا حال کروں . . . .

اسی خط میں وہ نیم مزاحیہ انداز میں گم نامی کی زندگی کی طرف واپسی کے امکان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

بھیڑ میں سے ایک ہونے کا تصور ہی میرے لیے وحشت خیز اور ناقابلِ برداشت ہے۔ دل اس خیال سے بجھ کر رہ جاتا ہے کہ میں بھی لاکھوں، کروڑوں کے ہجوم میں سے ایک شمار ہونے لگوں۔ آخر وہ سارے بڑے بڑے، ترقی پسند دعوے اور اعلان اور عزائم کیا ہوئے ؟ لیکن جب میں ارد گرد نظر دوڑاتا ہوں تو اپنے تقریباً تمام ترقی پسند دوست اسی رنگ میں رنگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ہر وقت عوام کی باتیں کرتے ہیں، لیکن عملاً ان کی بیش تر قوت عوام سے بلند تر ہونے کی کوشش میں ہی صرف ہوتی ہے۔ وہ یہی چاہتے ہیں کہ کچھ بن کر دکھائیں، کچھ نام پیدا کریں، کچھ شہرت حاصل کریں۔ میرے خیال میں ہم ایسوں کی زندگی میں یہی بنیادی تضاد کارفرما ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ اکثر اوقات ہمیں اس تضاد کا شعور بھی نہیں ہوتا . . . . بچپن سے ہی ہماری تعلیم اور تربیت اس انداز سے ہوتی ہے کہ ہم اوّلین اہمیت کا مستحق اسی مصروفیت کو سمجھتے ہیں جس کا صلہ روپے پیسے یا سماجی ترقی کے روپ میں ملے۔ جس مصروفیت سے اس قسم کا صلہ نہ حاصل ہو، اس کی ہم تعریف کر سکتے ہیں، اسے آدرش کا درجہ دے سکتے ہیں، مگر اسی وقت جب ہم تحفظ اور آرام و آسائش کی بلندی پر پہنچ جائیں۔ (خط : مارچ 1973)

بلراج کی مارچ 1973 کی ڈائری میں ایک صفحہ ایسا ہے جس میں ان کے دل کی ناقابلِ برداشت اذیت فریاد کرتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے لاکھ کوشش کی، مگر شبنم کے دکھ بھرے تصور سے دامن نہ چھڑا سکے اور نہ اس روح فرسا خیال نے ان کا پیچھا چھوڑا کہ وہ شبنم کے مسائل کو حل کرنے میں کتنے ناکام، کتنے بےبس رہے تھے۔ اپنی نااہلی کا پچھتاوا انھیں گھن کی طرح چاٹے جا رہا تھا۔ اگر بلراج اپنے

دل کا حال کھول کر رکھ دیتے، اگر وہ اپنے قریبی عزیزوں، دوستوں کو اپنے اندرونی کرب کا رازدار بنا لیتے تو شاید ان کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا اور انھیں کچھ سکون مل جاتا۔ لیکن یہ تو زندگی کے وہ ستم ظریفانہ 'اگر' ہیں جن کا ذکر ہم اس وقت کرتے ہیں جب آدمی ساری بازی ہار چکتا ہے اور اس کے لیے ساری بساط الٹ چکی ہوتی ہے۔ اس سے چند مہینے پہلے ہی کی بات ہے، بلراج دہلی آئے ہوئے تھے۔ میں اور میری بیوی انھیں ساتھ لے کر ایک ڈراما دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں اچانک ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ ڈراما ایک ایسی نوجوان لڑکی کے دکھوں اور مصیبتوں کے بارے میں ہے جس کی شادی غلط جگہ ہو گئی ہے۔ سچ مچ بہت الم ناک کہانی تھی اور بے چاری شبنم کی دکھ بھری سرگزشت سے بہت ملتی جلتی تھی۔ کئی مرتبہ میں نے کنکھیوں سے بلراج کی طرف دیکھا اور ہر مرتبہ مجھے ان کے رخساروں پر آنسو بہتے نظر آئے۔ لیکن جب انٹرویل ہوا اور سارا ہال روشنیوں سے جگمگا اٹھا تو بلراج کی کوشش یہی رہی کہ ان کا رویہ اور انداز بالکل معمول کے مطابق ہو۔ انھوں نے اپنا آدھا چہرہ رومال سے ڈھانپ رکھا تھا تاکہ لوگ انھیں پہچانیں نہیں۔ لوگوں کی توجہ سے بچنے کے لیے یہ نسخہ اکثر آزماتے تھے۔ لیکن اُس روز رومال ان کے آنسوؤں کو چھپانے کا کام بھی کر رہا تھا۔ پھر جب ہم نے باقی ڈراما دیکھے بغیر ہی اُٹھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا تو بلراج بار بار اصرار کرتے رہے کہ ہم پورا ڈراما دیکھے بغیر نہ جائیں۔ اس کے ساتھ وہ معذرت کا اظہار بھی کرتے رہے کہ انھوں نے سارا مزہ کرکرا کر دیا ہے۔

● وفات سے لگ بھگ ڈیڑھ مہینے پہلے 3 مارچ 1973 کو بلراج نے اپنی ڈائری میں اس طرح اپنے دل کے ناسور کی جھلک دکھائی تھی:

> ہماری پیاری شبنم کو ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑے ہوئے ایک سال بیت چکا ہے۔ خود مجھ میں تو کسی سے اتنا پوچھنے کی بھی ہمت نہیں کہ اس کی وفات کی تاریخ کیا تھی۔ یہ صرف میرے دل کا اندازہ ہے کہ اس کا انتقال آج کے روز ہوا تھا۔ 3 نومبر کو وہ اس دنیا میں آئی تھی، 3 مارچ کو اس دنیا سے کوچ کر گئی۔
>
> بہت پہلے سے میں نے سوچ رکھا تھا کہ اس روز میں برت رکھوں گا۔ صبح کو سات بجے کے قریب میں ساحل پر پہنچ گیا۔ مایوس، اُداس، دل گیر۔ شدید دکھ کا بوجھ دل پر لیے۔ میرا خیال تھا کہ ایک دو گھنٹے میں شاید میں کسی قدر سنبھل جاؤں گا، شاید آنے والے دنوں میں سانس لینے کے لیے اُمید کی کوئی کرن مجھے نظر آجائے گی۔ مگر نہیں۔ میرا کرب بڑھتا ہی گیا.... میں نے ساحل کے ریت پر ایک سیاہی مائل

پتھر پڑا دیکھا۔ اسے نشان قرار دے کر میں نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ سمندر میں اس وقت مد کا عالم ہے یا جزر کا۔ کافی دیر تک علامتوں سے دونوں ہی کیفیتیں ظاہر ہوتی رہیں۔ غالباً وہ پتھر جسے میں نے اپنا نشان قرار دیا تھا، کچھ زیادہ ہی فاصلے پر پڑا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی کے پاؤں کا نشان تھا۔ اتنے میں مد بڑھنے لگا اور چند لمحوں میں لہریں پاؤں کے نشان کو بہا لے گئیں۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ کھیتوں میں رہنے والا ایک چوہا ریت پر آوارہ گردی کرتا پھر رہا ہے۔ شاید وہ قریب کے باغیچے سے نکل کر گھومتا ہوا ساحل پر آنکلا تھا۔ اب وہ بہت تھک چکا تھا۔ زور کی پیاس اسے پانی کی طرف بڑھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک خطرہ اسے دوسرے خطرے سے نجات دلا دے گا۔ اتنے میں ایک لہر آئی اور اسے بھگو گئی۔ وہ اسے تقدیر کا حکم سمجھ کر چپ چاپ وہیں پڑا رہا۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ جسم کو حرکت دینے اور جدوجہد کرنے کی قوت اس میں باقی ہی نہیں رہی تھی۔ اور پھر جلد ہی اُسے آخری نجات حاصل ہو گئی۔

میرے دل میں بھی ایسی ہی نجات کی آرزو سر اُٹھانے لگی ہے۔

کچھ دیر بعد کبیر بیدی اور اس کا بچّہ اُدھر آنکلے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ بڑا پیارا سا بچّہ ہے۔ میں نے اس سے فوراً دوستی کر لی۔ ایک زمانے میں اسی طرح شبنم کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اسے ساحل پر خوب دوڑاتا تھا۔ میں اور میرے ساتھ کوئی اور اس کے بازو پکڑ کر اُسے جُھلاتے اور اس سے کہتے کہ ہم نے اسے ہوائی جہاز بنا دیا ہے۔

مجھ سے کچھ فاصلے پر پریکشت اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آج وہ بہت صحت مند، بہت اچھا لگ رہا تھا۔ خدا اس کی عمر لمبی کرے، اسے کامیابی دے۔ میں چلتے چلتے اس کے پاس سے گزرا اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جا کر میں پھر بیٹھ گیا۔ انجو اور کوکی بھی گھومتی ہوئی اُدھر آگئیں۔ کچھ لمحے کے بعد کوکی تو چہل قدمی کے لیے چلی گئی اور انجو قریب ہی ساحل پر لیٹ کر ریت پر ڈیزائن بنانے لگی۔

آخر وہ دونوں بھی رخصت ہو گئیں۔ لگ بھگ ایک بجے کا وقت ہو رہا تھا.... مجھ پر ویرانی اور خالی پن کا احساس چھا گیا اور میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر ڈالا کہ آئندہ میں پنجاب جا کر رہوں گا اور وہیں مروں گا۔

.... جب میں واپس گھر کی طرف چلنے لگا تو مجھے ایسا لگا کہ شبنم کی آواز مجھے پکار رہی ہے : " آئیے ، ڈیڈی ! ڈیڈی ، اِدھر آئیے !"

8 اپریل کو وفات سے صرف پانچ دن پہلے بلراج نے مجھے ایک مختصر سا خط لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے یہ اطلاع دی تھی کہ 13 اپریل کو وہ پنجاب کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے اصرار کے ساتھ یہ تاکید بھی کی تھی کہ میں دہلی سے ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار رہوں۔ اسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہنا چاہیئے کہ بلراج کے پاس سے آیا ہوا یہ واحد خط تھا جسے میں نے پھاڑ کر پھینک دیا تھا، محض یہ سوچ کر کہ اس میں کوئی خاص بات تو لکھی نہیں ہے، صرف یہ اطلاع ہے کہ وہ پنجاب میں جا بسنے کے ارادے سے دہلی آرہے ہیں۔ اور پھر یہ اطلاع بھی بجائے خود نئی نہیں تھی۔ اس قسم کے خط وہ پہلے بھی لکھتے رہے تھے۔ اگرچہ ان میں سے کسی کو بھی میں نے ضائع نہیں کیا تھا۔ افسوس! اب جب انھوں نے پنجاب کو واپسی کا پکا تہیہ کر لیا تھا تو بھی ان کا دیرینہ سپنا پورا نہ ہوا۔ موت کا فرشتہ انھیں لے اُڑا۔

بلراج نے 13 اپریل 1973 کو اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ پنجابی اس دن کو بہت مبارک سمجھتے ہیں۔ اب یقین کے ساتھ کہنا تو مشکل ہے، مگر غالب امکان یہی ہے کہ ان کا اندرونی صدمہ ہی دل کے اس شدید دورے کا سبب بنا ہوگا جس نے ان کو موت کے آغوش میں سُلا دیا۔ ویسے وہ ہمیشہ صحت مند اور چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ صرف ایک مرتبہ جب آگرہ میں "گرم ہوا" کی شوٹنگ چل رہی تھی تو انھوں نے جسمانی نظام میں کچھ گڑبڑ کی شکایت کی تھی، لیکن پھر اسے جگر کا فعل سُست پڑ جانے سے منسوب کر کے اسے بھول گئے تھے۔ یہاں تک کہ جس روز دل کا دورہ پڑا ہے، اس صبح کو بھی وہ اپنے آپ کو بالکل ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہے تھے۔ روزانہ کے معمول کے مطابق اس صبح کو بھی وہ سمندر میں تیرنے کے لیے گئے، کچھ دیر ورزش کی اور پھر اسٹوڈیو جانے کی تیاری کرنے لگے۔ روانگی کے لیے تیار ہونے کے بعد وہ اسٹوڈیو کی طرف سے فون کا انتظار کرتے رہے۔ اس وقفے میں انھوں نے سوچا کہ لیٹ کر تھوڑا سا آرام ہی کر لیں۔ پھر یکایک انھیں بے چینی ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ دل کا بھاری دورہ پڑا ہے۔ لپک جھپک انھیں نانا وتی ہسپتال لے جایا گیا۔

بلراج کے مزاج کی مخصوص ساخت آخری وقت میں بھی اپنی جھلک دکھانے سے باز نہ آئی۔ ہسپتال میں ان کے کمرے تک پہنچانے کے لیے انھیں لفٹ میں سوار کرایا گیا۔ جو ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا، لفٹ میں ان کے پاس ہی کھڑا تھا۔ بلراج نے دو سطریں املا کرائیں اور ڈاکٹر نے کاغذ کے ایک پُرزے پر انھیں قلم بند کر لیا۔

مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔
میں نے نہایت بھرپور اور خوش و خرم زندگی بسر کی ہے !

9

پس نوشتہ

بلراج اس جہانِ خاکی سے کنارہ کر چکے ہیں۔ ان کو گزرے ہوئے ساتھ برس سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ لوگ انھیں محبّت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی گرم جوشی، ملنساری، خلوص اور ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیلا دینے کی ادا یاد آتی ہے؛ ان کا بے مثال فن اور فن کی بازی گاہ میں ان کے کارنامے یاد آتے ہیں، ہماری ثقافتی زندگی کو ان کی دین یاد آتی ہے۔ ہمارے ملک کی ایک کہاوت ہے کہ مرنے کے بعد ایک بیش بہا شے آدمی اپنے پیچھے اس دنیا میں چھوڑ سکتا ہے، اور وہ ہے ایک خاص مہک، اس کی شخصیت کی ایک خاص خوشبو، جو اس کی زندگی کے سارے کاموں اور ساری سرگرمیوں سے پھوٹتی ہے۔ اور بلراج یہی مہک، یہی خوشبو قابلِ رشک حد تک چھوڑ گئے ہیں۔

شاید ایک بھائی کے لیے ایک ایسی ہستی کا بے لاگ ہو کر جائزہ لینا بہت دشوار مرحلہ ہے جو اس کے اتنی قریب رہی ہو، جس کا وہ ساری زندگی پرستار رہا ہو۔ مگر میری نظر میں سوانح عمری بنیادی طور پر کسی آدمی کی شخصیت کی توانائی کے ان سرچشموں کو دریافت کرنے کا عمل ہے، جنھوں نے اسے اس کا حقیقی روپ دیا۔ سوانح عمری کسی شخص کی کم زوریوں یا ناکامیوں یا کوتاہیوں کی جستجو میں رہنے کا نام نہیں ہے جو لگ بھگ ہر انسان کے حصّے میں کسی نہ کسی حد تک آتی ہی ہیں۔ اگر کوئی آدمی اوروں سے نمایاں ہوتا ہے، قدآور نکلتا ہے، اپنے لیے اونچا مقام پیدا کرتا ہے، تو یہ سب کچھ وہ ان کم زوریوں اور ناکامیوں اور کوتاہیوں کے باوصف کرتا ہے۔ حتمی طور پر جب ہم اسے پرکھتے ہیں تو اس کی ناکامیوں کی بنیاد پر نہیں، اس کے کارناموں کی بنیاد پر پرکھتے ہیں، یہ دیکھ کر اس کی قدر و قیمت آنکتے ہیں کہ سماج کو اس نے کیا دیا ہے۔

بلراج سراسر یک رنگ تھے۔ ان کے ظاہر اور باطن میں کوئی تضاد، کوئی دوغلاپن نہ تھا۔ ہر قسم کے حالات میں وہ وہی رہتے تھے جو حقیقت میں تھے۔ اپنے اصل روپ کو وہ کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے دل میں کچھ ہو، رویّہ اور برتاؤ سے کچھ اور جھلکے، محسوس وہ

1985 لے میں بارہ برس ہو گئے ہیں۔

کچھ کریں، طرزِ عمل کچھ اور ہو۔

ایک طرح کی عجلت پسندی، سرکشی اور ضد ان کے خمیر میں شامل تھی۔ یہ خصوصیت ان کی جوانی کے دنوں میں زیادہ نمایاں رہی۔ اس نے انھیں بہت بے باک، نڈر، خطروں میں بے دھڑک کود پڑنے کا عادی بھی بنایا۔ وہ پہلے سے زیادہ سوچ بچار کیے یا نفع، نقصان، کا حساب لگائے بغیر ہی جست لگا بیٹھتے تھے اور بار ہا یہ جست انھوں نے مکمل اندھیرے میں لگائی۔ اس طرح کے کتنے ہی واقعات ذہن میں اس وقت آ رہے ہیں جب انھوں نے بے انتہا نا عاقبت اندیشی اور جلد بازی دکھائی تھی۔ ان میں سے کچھ مواقع چھوٹے موٹے تھے، کچھ بہت اہم اور سنگین۔ نوجوانی کے دنوں میں ایک مرتبہ وہ کالج کا بلیزر اور نیکر پہنے ہوئے بڑی بے نیازی اور بے جگری کے ساتھ انگریزوں کے کلب میں جا گھسے تھے (اور وہ بھی اُس وقت جب محفلِ رقص شباب پر تھی) — صرف اس لیے کہ ایک دوست نے انھیں یہ جسارت کرنے کے لیے للکارا تھا۔ ایک اور موقع پر آندھی اور طوفان کی طرح ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں جا دھمکے، جب کہ کمشنر موصوف نے اپنے چپراسی کو ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کے کمرے میں کسی بھی داخل نہ ہونے دیا جائے۔ یہ تو بوکھلا ہی گیا۔ مگر بلراج نہ صرف کمشنر کے دفتر میں زبردستی جا گھسے، بلکہ کمشنر کی ہدایت کو بنیاد بنا کر اس سے تکرار بھی کر بیٹھے۔ دراصل وہ عملی قدم اُٹھانے سے پہلے ٹھنڈے دل سے معاملے کے موافق اور ناموافق پہلوؤں اور عواقب کے بارے میں کم ہی سوچتے تھے۔ ایک مرتبہ ان پر کوئی دھن سوار ہونے کی دیر تھی، پھر مسئلے کے مثبت اور منفی رُخوں پر سوچ بچار کرنے کا ان کے لیے سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ اسی عالم میں انھوں نے گھر چھوڑ کر شانتی نکیتن کی راہ پکڑی تھی۔ اسی ترنگ میں شانتی نکیتن سے واردھا اور واردھا سے انگلستان پہنچے تھے۔ ان کے کردار کی اس خصوصیت کا ایک مثبت زاویہ بھی تھا۔ اس کی بدولت فن کار کی حیثیت سے انھوں نے نئے نئے، جرأت مندانہ تجربے کیے، اپنی جھجک اور کمزوریوں پر قابو پایا، اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کیا۔ اگر کسی شے میں ان کی دل چسپی نہ رہتی یا وہ یہ محسوس کرتے کہ اس کی وجہ سے وہ پابند اور مقید ہو کر رہ گئے ہیں تو اس سے دامن چھڑانے میں وہ ذرا بھی دیر نہ لگاتے۔ دولت کی ان کی نظر میں زندگی کے کسی بھی مرحلے پر اہمیت نہیں رہی — نہ تنگ دستی کے دنوں میں، نہ خوش حالی کے دور میں۔ راہِ عمل کا انتخاب کرتے وقت روپے پیسے کا خیال ان پر کبھی اثر انداز نہیں ہوا۔

لیکن بلراج کی عجلت پسندی اور ترنگ کے تحت عمل کرنے کا میلان ناکارہ لاأبالی پن کا دوسرا نام نہ تھا۔ یہ تو خوب سے خوب تر کی جستجو تھی۔ اظہارِ ذات کے زیادہ مؤثر، زیادہ بھرپور وسیلے ڈھونڈنے کی کوشش تھی۔ زیادہ علم و آگاہی اور تجربے کی کھوج تھی، جو انھیں سیماب صفت بنا دیتی تھی۔ وہ دنیا طو

اور روایتوں کے لگے بندھے حصار میں بند ہوکر نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسے سانچے میں وہ اپنے آپ کو ڈھال ہی نہیں سکتے تھے۔ پہلے سے طے شدہ خطوط پر نہ وہ سوچ سکتے تھے، نہ عمل کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے بارے میں لکھا بھی تھا: "میں وہ کہاوتی بندر ہوں جو آگ سے گریزاں بھی رہتا ہے اور آگ میں ہاتھ ڈالنے پر مجبور بھی ہوتا ہے۔"

بلراج میں زندگی کا جو ولولہ اور جوش تھا، وہ دوسروں کو بھی فوراً اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ جس شے سے بھی انھیں الفت ہوئی، بے پناہ الفت ہوئی اور اسے انھوں نے خود کو مکمل طور پر سونپ دیا، چاہے وہ تھیٹر ہو یا پنجابی زبان، یا پھر فلموں کے رول۔ جو کام بھی وہ ہاتھ میں لیتے، پورے جوش و خروش اور لگن کے ساتھ اسی کے ہو رہتے۔ مشینی انداز سے یا نیم دلی سے وہ کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ رجائیت اور زندگی سے محبت ان کے وجود سے اس طرح پھوٹتی تھی جیسے سورج سے کرنیں۔ تاریک ترین لمحوں میں بھی وہ زندگی کو ایک بیش بہا نعمت سمجھتے تھے، جس کا ایک ایک لمحہ بھرپور ڈھنگ سے، خوشی کا رس نچوڑ کر جینا چاہیے۔ یہی سبب ہے کہ اپنی ناکامیوں اور مایوسیوں پر قابو پانے کے لیے وہ اتنی کڑی جد وجہد کرتے تھے۔

بلراج کا خیال مجھے جب کبھی آتا ہے تو ان کی خوش باش، چونچال، دل چسپیوں کی رسیا طبیعت کی یاد سب سے پہلے آتی ہے۔ وہ دہلی آتے تھے تو ہمارا معمول یہی رہتا کہ اپنی پرانی موٹر سائکل پر سوار ہوکر نکل کھڑے ہوتے۔ کبھی دوستوں اور عزیزوں سے ملنے چلے جاتے، کبھی سناور تک کا لمبا سفر کر ڈالتے، جہاں ہمارے بچے پڑھ رہے تھے۔ گھر سے باہر آتے ہی بلراج کبھی بے اختیار گانے لگتے، کبھی لہک لہک کر اشعار پڑھتے، کبھی کوئی تازہ ترین رام کہانی یا ادھر ادھر کی باتیں سناتے۔ صاف گوئی اور بے باکی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لوگ ان کے بارے میں کیا سوچیں گے یا کیا کہیں گے، اس کی انھیں قطعی پروا نہیں رہتی تھی۔ ہمارے ایک پرانے دوست ہیں، گل کپور۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ بمبئی میں ان کے بیٹے کی شادی کے موقع پر پنجابی رواج کے مطابق بلراج کچھ اور براتیوں کے ساتھ بمبئی کی سڑکوں پر بے جھجک بھنگڑا ناچتے رہے تھے۔ انھیں اس بات کی مطلق فکر نہ تھی کہ انھیں دیکھنے کے لیے پورا ہجوم جمع ہو گیا ہے۔ وہ جب دوستوں کے جھرمٹ میں ہوتے تو بے تکلفی اور آزاد روی ان کے سارے وجود سے جھلکتی اور ایک خاص فضا پیدا کر دیتی۔ وہ مزے سے ساری محفل کو اپنے لطیفوں، قصوں، واقعات اور آپ بیتی سے محظوظ کرتے رہتے۔ ان کی خوش طبعی اور ولولہ محفل میں موجود ہر شخص کے دل کو گرما دیتا۔ لمبی چہل قدمی، مختلف مقامات کی سیر، ہر طرح کے تجربے کرنا، ہر

قسم کے لوگوں سے ملنا ـــــ یہ سب ایسی باتیں تھیں جن میں انھیں بہت لطف آتا تھا۔
ان کا دل محبت اور خلوص کی گرمی سے معمور تھا، پُرشوق تھا، کشادہ تھا۔ اپنے اسکول اور کالج کے دور کے پُرانے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ وہ پابندی سے رابطہ قائم کیے رہتے تھے۔ زندگی کے آخری دنوں تک انھوں نے یہ روایت نبھائی۔ بیٹے کی حیثیت سے بھی انھیں ماں باپ سے بہت گہرا، قوی لگاؤ تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے لکھا تھا:

جوانی کا دور اب زوال پر ہے۔ ہماری ایک دوسرے سے جدائی مجھ پر اور بھی زیادہ شاق اور گراں گزرنے لگی ہے۔ تمھارے ساتھ، ماں باپ کے ساتھ رہے ہوئے برسوں بیت گئے! تم سب سے دور رہ کر میں جس قسم کی زندگی بسر کر رہا ہوں وہ مجھے بہت بناوٹی، سرابی اور بے معنی محسوس ہوتی ہے . . . .

ایک اور موقع پر میرے مختصر، سپاٹ، دوٹوک انداز کے خطوں کی شکایت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

تمھارے خطوط پڑھ کر کچھ مزہ نہیں آتا۔ مجھے تو ایسے خط پسند آتے ہیں جن سے مجھے گرم جوشی کے ساتھ گلے ملنے کا احساس ہو۔

پتا جی کے نام ایک خط میں ایک بار انھوں نے اِس طرح دل کی بات کہی تھی:

. . . . میں پوری طرح آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا، مگر اس شرط پر کہ اکتوبر یا نومبر میں جب موسم کچھ سرد ہو جائے تو آپ دونوں یہاں ضرور آئیں گے اور کم از کم چھ مہینے تک ہمارے ساتھ ہی رہیں گے . . . . اگر اس درمیان' میں کار کا مالک بن گیا تو پھر میں خود دہلی پہنچوں گا اور آپ کو یہاں اپنے ساتھ ہی لے آؤں گا۔

جب فلم ایکٹر کی حیثیت سے بلراج کے قدم جم گئے اور حالات سدھر گئے تو انھیں دوسروں کی ضرورتوں کا اور بھی زیادہ خیال رہنے لگا۔ جس کو بھی وہ ضرورت مند پاتے، اسے بے طلب، چپ چاپ روپے بھیج دیتے۔ مجھے بھی اکثر لکھتے رہتے کہ ان کی طرف سے ایسے رشتہ داروں کی مدد کرتا رہوں جو تنگی ترشی سے بسر کر رہے ہیں یا جن پر بُرا وقت آپڑا ہے۔
بلراج کے ایک پُرانے دوست اور ساتھی راجندر بھاٹیہ صاحب نے مجھے ایک ایسا واقعہ سنایا تھا جو بہت انکشاف انگیز ہے۔ ایک روز بلراج کا ایک ٹائپ رائٹر چوری ہو گیا۔ دن پر دن گزرتے گئے، مگر اس کا کہیں سُراغ نہ ملا۔ تھک ہار کر بلراج صبر کر کے بیٹھ رہے۔ پھر ایک دن بھاٹیہ صاحب کو یکایک

وہی ٹائپ رائٹر ایک دُکان میں رکھا مل گیا۔ دکان دار سے پوچھنے پر انھیں معلوم ہوا کہ ایک نوجوان اسے بیچنے کے لیے دکان میں چھوڑ گیا ہے۔ مزید تفتیش سے یہ بھید کُھلا کہ وہ نوجوان کوئی اور نہیں، بلراج کے ایک پُرانے دوست کا بیٹا ہے۔ جب بھاٹیہ صاحب نے بلراج کو سارا ماجرا سنایا تو بلراج نے کچھ رقم بھاٹیہ صاحب کو دی اور ان سے کہا کہ کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر دکان سے وہ ٹائپ رائٹر خرید لائیں۔ وجہ انھوں نے یہ بیان کی : "معلوم ہوتا ہے بے چارہ لڑکا سخت پریشانی میں ہے اور روپے کی اسے بہت ضرورت ہے۔ اس طرح اسے پریشانی سے چھٹکارا پانے میں کچھ مدد مل جائے گی۔"

جس روز بلراج کا انتقال ہوا، بہت بڑا ہجوم ان کے گھر کے اندر اور باہر جمع ہو گیا تھا۔ دوستوں رشتہ داروں اور کچھ معززین کے علاوہ طرح طرح کے لوگ اِس بھیڑ میں شامل تھے، مثلاً پھیرے، ہوٹلوں کے بیرے، علاقے کے غریب غربا، یہاں تک کہ سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے والے چھوکرے بھی۔ ان کا مکان ایک عوامی مقام بنا ہوا تھا۔ مگر اس وقت میرا دل اور بھی بھر آیا جب مجھے معلوم ہوا کہ بلراج کی موت کی خبر سن کر مچھیرے پیدل چل چل کر ورسووا سے اتنی دور پہنچے تھے اور رات بھر بلراج کے خاکی جسم کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ اسی طرح ہوٹلوں کے بیرے دور دور سے آئے تھے۔ جب یہ لوگ مالکوں کے خلاف لمبی ہڑتال کیے ہوئے تھے تو بلراج نے اس دور میں ان کی مالی مدد کی تھی۔ غریب لوگوں میں سے ہر شخص ایسا تھا جس کی بلراج سے کسی نہ کسی وقت ذاتی وابستگی رہی تھی اور جس کی نظر میں بلراج عزیزوں سے بڑھ کر عزیز تھے۔ یہ سب کے سب کسی فلم اسٹار کے رسمی پرستار نہیں، انسانیت نواز بلراج کے حقیقی شیدائی تھے۔

عام لوگوں کے ساتھ گھُلنے ملنے میں، بسوں اور ٹرینوں میں سفر کرنے میں، بلا امتیاز ہر قماش اور ہر حیثیت کے آدمیوں سے تعلقات رکھنے میں بلراج کو جو خوشی ملتی تھی، شاید ہی کسی اور بات میں ملتی ہو۔ ایک مرتبہ ہم دونوں نے جموں سے دہلی کا سفر بس کے ذریعہ کیا۔ ایک دن میں یہ سفر پورا ہوا۔ بلراج ان دنوں ایک نام ور شخصیت بن چکے تھے۔ راستے میں بس جس مقام پر رُکتی، لوگ انھیں پہچان لیتے اور ان کے گرد چھوٹی سی بھیڑ جمع ہو جاتی۔ پھر کوئی چاہنے والا ان سے اصرار کرنے لگتا کہ اس کی دُکان پر چائے ضرور پئیں، بوٹ پالش کرنے والا ان کے جوتے چمکانے پر مصر ہو جاتا۔ اور چونکہ کیمرہ بلراج کے کندھے پر ہمیشہ لٹکا رہتا تھا، اس لیے بہت سے لوگ ان کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی ضد بھی کر بیٹھتے۔ اس طرح کی باتیں لگ بھگ ہر اسٹاپ پر ہوتی رہیں۔ اس روز میں نے بہت سے فوٹو لیے۔ بلراج ان سب لوگوں کے پتے لکھتے رہے جن کے ساتھ ان کا فوٹو لیا گیا تھا۔ کچھ نہیں تو اس قسم کے تیس فوٹو

تو ضرور ہی لیے ہوں گے۔ اس کے بعد بمبئی پہنچنے پر دو ہفتے کے اندر بلراج نے مجھے فوٹوؤں کا ایک بڑا سا پیکٹ بھیجا۔ اس کے ساتھ پتوں کی ایک لمبی فہرست بھی تھی۔ منسلک خط میں مجھے تاکید کی گئی تھی کہ سارے فوٹو متعلق اشخاص کو بھیج دوں۔

چند برس بعد ہجوم سے نمٹنا ان کے قابو سے باہر ہونے لگا۔ مگر ان کی خواہش پھر بھی یہی رہی کہ عوام کے درمیان گھومیں پھریں۔ اس خواہش کو پورا کرنے کی خاطر انھوں نے اپنے لیے ایک مکھوٹا ایجاد کیا۔ اس کی مدد سے وہ جہاں چاہتے، آزادی سے، شناخت ہوئے بغیر گھوم پھر آتے۔ یہ مکھوٹا ایک سادہ سے نسخے پر مبنی تھا۔ ایک چشمہ (جس میں شیشے نہیں لگے ہوئے تھے)، ایک مصنوعی ناک اور اس کے نیچے تتلی جیسی مونچھیں۔ انھیں لگا کر وہ مزے سے جہاں جی میں آتا، آتے جاتے تھے۔

انسانوں کے ساتھ میل جول کو انھوں نے سنجیدہ کتابوں کے کثیر مطالعہ کے ساتھ ملا رکھا تھا۔ ان کا مطالعہ بہت رنگارنگ تھا۔ ادب، سیاسی تصانیف، سماجی اور تاریخی تحریریں، عام دلچسپی کی کتابیں ـــــ سب ہی کچھ اس میں شامل تھیں۔ لیکن جاسوسی فکشن پڑھتے ہوئے وہ شاید ہی کبھی پکڑے گئے ہوں، بالکل اسی طرح جیسے تاش کھیلتے وہ شاید ہی کبھی نظر آئے ہوں۔ تاہم ان میں کتابی علم تک خود کو محدود رکھنے کی کوئی ادا نہ تھی اور نہ اپنے علم و آگاہی پر بے جا ناز تھا۔ اپنے علم کو وہ عالمانہ غرور کے ساتھ نہیں، ہلکے پھلکے ڈھنگ سے، سرسری انداز میں برتتے تھے۔

یہ فکر بلراج کو ہمیشہ رہتی تھی کہ زندگی میں آدمی کا مجموعی تناظر جس حد تک بھی ممکن ہو درست رہے۔ صحیح اور متوازن تناظر حاصل کرنے کی غرض سے ہی وہ ہر قبیل اور ہر حیثیت کے لوگوں سے ملتے جلتے تھے، سنجیدہ کتابیں پڑھتے تھے اور ان تمام باتوں کا مشاہدہ کرنے کی مشقت اٹھاتے جو ان کے سماجی شعور کو پروان چڑھانے میں مدد دیں۔ اگر وہ سیلاب زدہ علاقوں یا فرقہ وارانہ فساد کی زد میں آئے ہوئے مقامات کا دورہ کرتے ہیں اتنی بے تابی دکھاتے تھے تو اس کی محرک سماج کے کام آنے کی خواہش تو ہوتی ہی تھی، جو کچھ ہو رہا ہے اسے حقیقت میں دیکھنے اور قریبی طور پر اس سے آگاہ ہونے کی آرزو بھی کارفرما رہتی تھی۔ ایک فن کار، ایک ادیب، ایک شہری کے طور پر اسے وہ اپنے کام، اپنے منصب کا لازمی حصہ سمجھتے تھے۔

یہ تھی بلراج کی ساخت۔ یہ تھا بلراج کا بنیادی روپ ـــــ انکسار کا پتلا، بے حد محنتی اور جفاکش شخص، دیانت داری اور سالمیت کی دولت سے مالا مال ایسا آدمی جو خود اپنے بل بوتے پر

آگے بڑھا تھا، خود اپنے برتے پر سر بلند ہوا تھا۔ ان کی مستقل مزاجی، لگن اور کڑی محنت نے انھیں شہرت ہی عطا نہیں کی تھی، کچھ کر دکھانے کا احساس ہی نہیں بخشا تھا، بلکہ ایک درخشاں، روشنی بکھیرتی، مکمل اور سجل شخصیت بھی بنا دیا تھا۔ ہمارے دور میں ایک فن کار کو کیسا ہونا چاہیئے، شاید بلراج اس کی بہترین جیتی جاگتی مثال تھے۔ اور ممتاز صحافی اور "سوشلسٹ انڈیا" کے سابق ایڈیٹر اقبال سنگھ کے لفظوں میں :

> بلراج اپنے ہر فعل اور ہر ردِ عمل میں اس حد تک ہمدردی اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے کہ کبھی کبھی یہ خوبی ان کے حق میں خامی بن جاتی تھی۔ ہر اس نصب العین سے جس سے انھیں لگاؤ تھا (اور ان میں سب سے زیادہ مرکزی حیثیت خود ہندستان کو حاصل تھی) اور ہر اس شخص سے جس کو انھوں نے اپنے دوستوں کے حلقے میں شامل کر رکھا تھا، ان کی وفاداری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ سب لوگ جو ان سے قریبی طور پر واقف تھے، ہمیشہ ان کی کمی محسوس کریں گے اور کوشش کرنے پر بھی انھیں کبھی نہیں بھول سکیں گے ....
>
> ("سوشلسٹ انڈیا" : 21 اپریل 1973)

بلراج ، جوانی کی دہلیز پر ۔

بلراج ۔ لاہور میں طالبِ علم کے روپ میں۔

دمینتی ، شانتی نکیتن کی طالبہ کے روپ میں ۔

بلراج اپنی دونوں بیٹیوں شبنم اور صنوبر کے ساتھ دارجلنگ میں۔

بلراج، سنتوش اور صنوبر۔ 1953 میں بلراج سیاسی قیدی کے طور پر بمبئی کی جیل میں بند رہے تھے۔ یہ فوٹو ان کی رہائی کے بعد لیا گیا تھا۔

بلراج اپنے بیٹے پریکشت کے ساتھ فلم "پوتر پاپی" میں۔
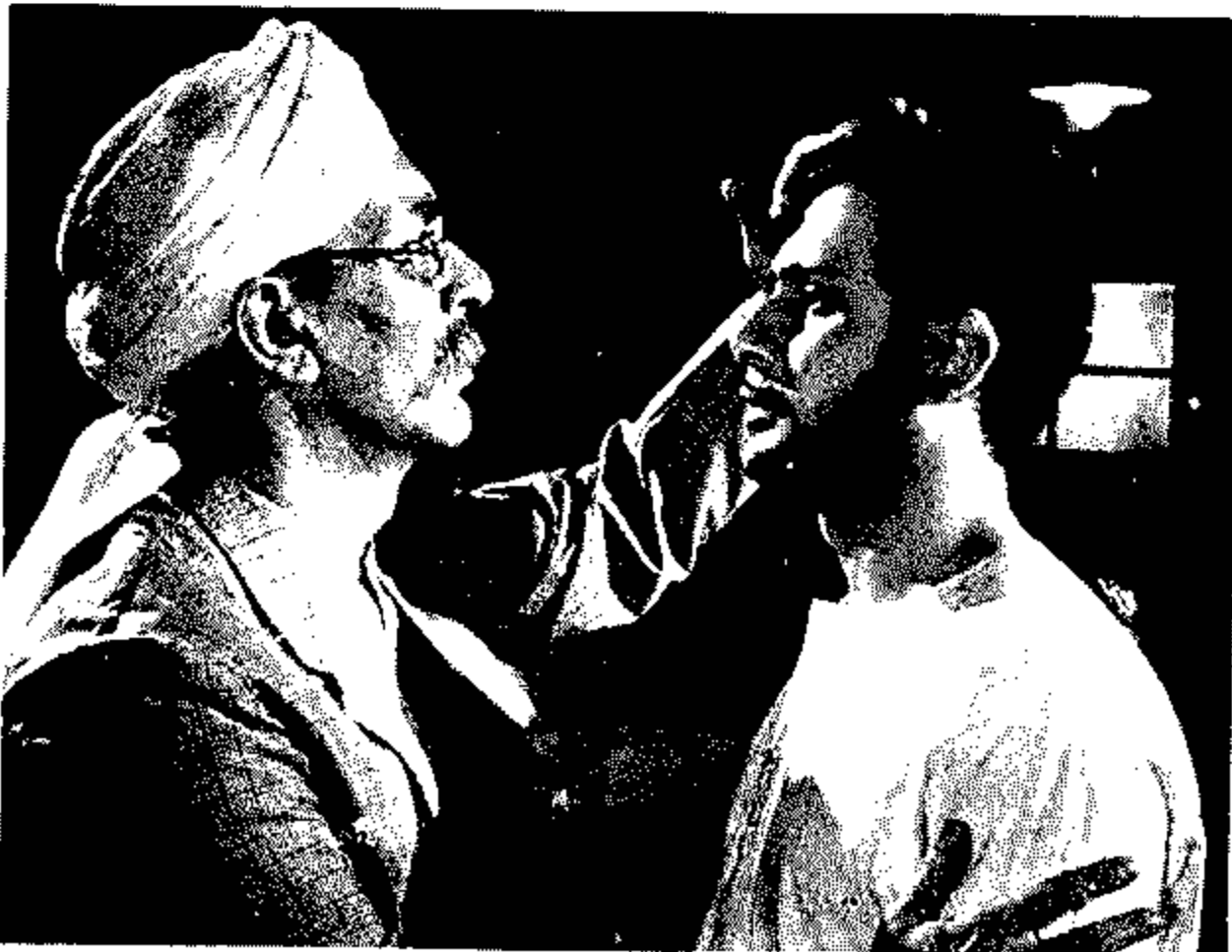
دمینتی مشہور مصورہ امرتا شیرگل کے ساتھ ۔

بلراج اور دمینتی فلم " دھرتی کے لال " میں ۔
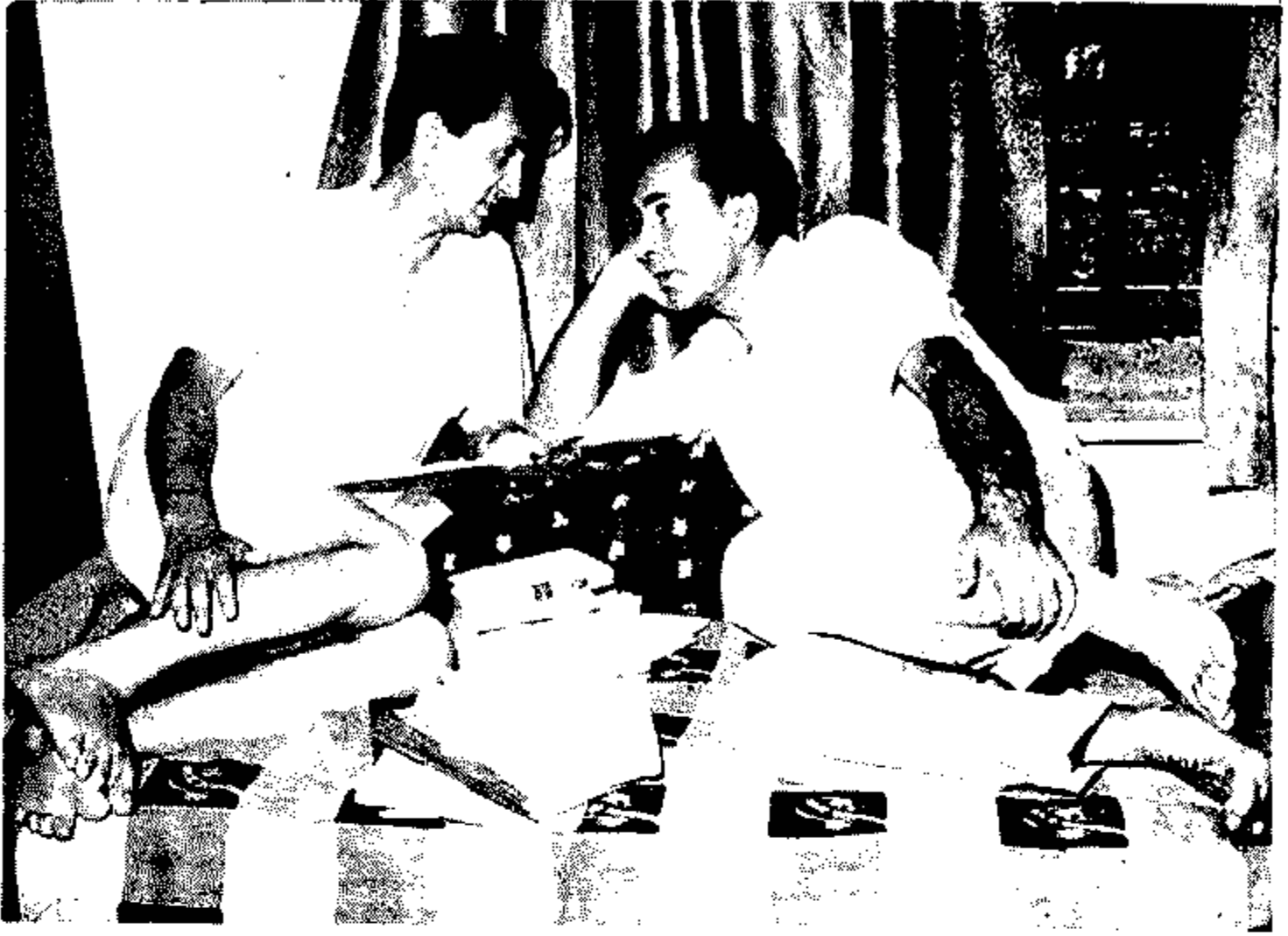
مصنف اپنے بھائی بلراج کے ساتھ۔

بلراج اور نروپا رائے فلم "دو بیگھہ زمین" میں۔

بلراج کے پتا جی شری ہربنس لال ساہنی
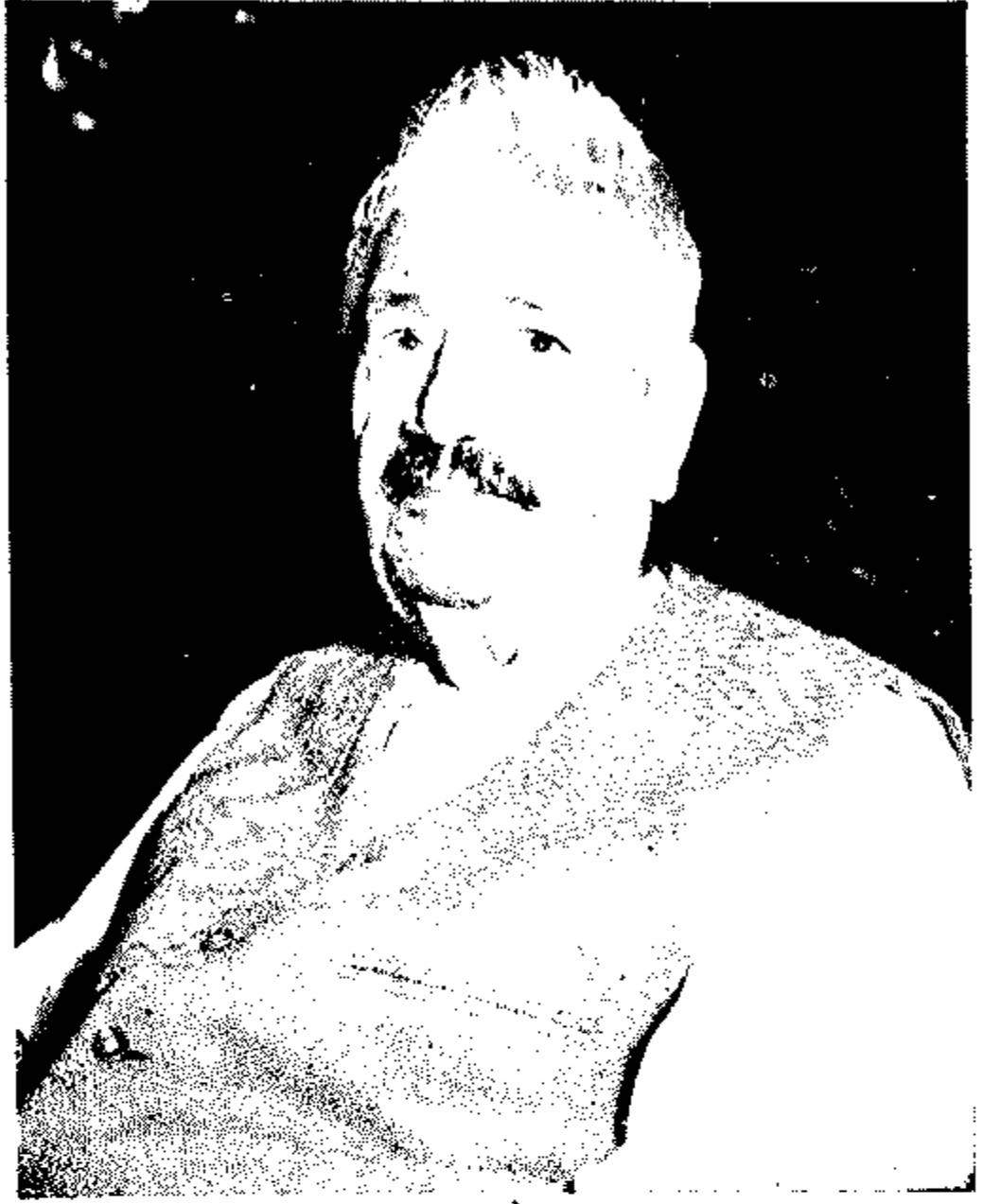
بلراج کی ماتا شریمتی لکشمی دیوی۔

بلراج ساہنی فلم اور اسٹیج کی دنیا کے ایک معروف شخصیت تھے۔ ایک ایسے دیدہ ور کے بیان کے مطابق جس نے بلراج کو قریب سے دیکھا تھا، وہ "اپنے ہر فعل اور ہر ردِ عمل میں اس حد تک ہمدردی اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے کہ کبھی کبھی یہ خوبی ان کے حق میں خامی بن جاتی تھی۔ ہر اس نصب العین سے جس سے انھیں لگاؤ تھا (اور ان میں سب سے زیادہ مرکزی حیثیت خود ہندوستان کو حاصل تھی) اور ہر اس شخص سے جس کو انھوں نے اپنے دوستوں کے حلقے میں شامل کر لیا تھا، ان کی وفاداری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ سب لوگ جو ان سے قریبی طور پر واقف تھے، ہمیشہ ان کی کمی محسوس کریں گے اور کوشش کرنے پر بھی انھیں کبھی نہیں بھول سکیں گے ...."

بھیشم ساہنی نے، جو ہندی کے معروف ادیب ہیں، اپنے بڑے بھائی کی زندگی کی یہ روداد اس طرح بیان کی ہے کہ قارئین اس عہد آفریں، درخشاں، روشنی بکھیرتی، مکمل شخصیت کو تاب و تواں بخشنے والے سرچشموں سے پوری طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔

یہ کتاب "قومی سوانح حیات کا سلسلہ" کے تحت شائع ہو رہی ہے جس کا مقصد ان ممتاز شخصیتوں کے سہل اور دل کش انداز میں لکھے ہوئے حیاتی خاکے پیش کرنا ہے جنھیں مادرِ ہندوستان نے مختلف شعبوں میں پیدا کیا ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا